مئی 2008

قیمت : -/10 روپے

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

جامع التذکرہ (جلد اوّل)

مؤلف: پروفیسر محمد انصار اللہ

شعرائے اردو کے تذکرے نہ صرف شعرا کے احوال و کوائف سے متعارف کراتے ہیں بلکہ ان میں شامل انتخاب کلام سے ان شعرا کی درجہ بندی اور ان کی ادبی قدر و قیمت پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ یہ تذکرے اردو تنقید کا اولیں نقش بھی ہیں۔ پروفیسر محمد انصار اللہ نے بڑی محنت سے اردو اور فارسی تذکروں میں شامل مختلف شعرا سے متعلق مواد کو حروف تہجی کے اعتبار سے یکجا کر دیا ہے۔

صفحات: 384، قیمت -/140 روپے

بحر الفصاحت (دو جلدوں میں)

مصنف: حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری

تدوین: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

''بحر الفصاحت''، نظم و نثر کے محاسن اور معائب پر ایک اہم کتاب ہے جو اپنے موضوع پر استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1885 میں رام پور کے مطبع سرور قیصری سے، اور دوسری اور تیسری بار مطبع منشی نولکشور، لکھنؤ سے بالترتیب 1917 اور 1926ء شائع ہوئی۔ یہ ایڈیشن 1926 کے ایڈیشن پر مبنی ہے۔

صفحات: 1621، قیمت -/730 روپے

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ

مصنف: ڈاکٹر قمر رئیس

پریم چند اردو کے ایک بڑے ناول نگار ہیں۔ اس کتاب میں پروفیسر قمر رئیس نے ان کی زندگی، ان کے تصور حیات، ان کے عہد اور ان کی تخلیقات کا مطالعہ اس خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ یہ کتاب حوالے کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ پہلی بار یہ کتاب دسمبر 1959 میں شائع ہوئی تھی۔ قومی اردو کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 424، قیمت 1-/52 روپے

کلیات سعادت حسن منٹو (پہلی جلد)

مرتب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ کونسل نے ایک بڑے منصوبے کے تحت ان کی تمام تحریریں جن میں افسانے، ریڈیو ڈرامے، فیچر، مضامین، خاکے وغیرہ شامل ہیں، شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلی جلد میں ''آتش پارے''، ''منٹو کے افسانے'' اور ''دھواں'' کے افسانے شامل ہیں۔ ساتھ میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

صفحات: 565، قیمت -/285 روپے

کلیات علی سردار جعفری

مرتب: علی احمد فاطمی

قومی اردو کونسل نے قدیم اور جدید عہد کی اہم اردو تصانیف کو زمانے کی دستبرد سے محفوظ رکھنے اور اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو موجودہ اور آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے ایک منضبط منصوبے کے تحت ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ''کلیات علی سردار جعفری'' اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کی پہلی جلد میں ''پرواز''، ''نئی دنیا کو سلام''، ''خون کی لکیر'' اور ''امن کا ستارہ'' اور دوسری جلد میں ''ایشیا جاگ اٹھا''، ''پتھر کی دیوار''، ''ایک خواب اور''، ''پیراہن شرر''، ''لہو پکارتا ہے'' اور بعد کی چند نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔

جلد اوّل صفحات: 496، قیمت -/164 روپے، جلد دوم: صفحات: 533، قیمت -/200 روپے

کلیات حسن نعیم

مرتب: احمد کفیل

نئی غزل کے پیش رووں میں حسن نعیم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں جو بانکپن نظر آتا ہے وہ اردو کی غزلیہ روایت میں انفرادیت کا ہے۔ ''کلیات حسن نعیم'' میں ان کی تمام شعری تخلیقات تاریخی ترتیب سے کر دی گئی ہیں۔

صفحات: 335، قیمت -/185 روپے

کوشش (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

اردو زبان میں فلمی منظر نامہ ایک نئی صنف ادب ہے۔ اسے بصری پیکروں کا ایک ایسا سلسلہ کہا جا سکتا ہے جو کہانی کی شکل اختیار کر لے۔ فلم ''کوشش'' کا یہ منظر نامہ جاپانی فلم ''ہیپی نیس آف اس الون'' پر مبنی ہے جس میں ایک گونگے بہرے لڑکے اور ایک گونگی بہری لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 84، قیمت -/48 روپے

میرے اپنے (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

قومی اردو کونسل نے فلمی منظر ناموں کی اشاعت خاص طور سے ان طلبہ اور طالبات کی رہنمائی کے لیے شروع کی ہے جو فلمی شعبے میں اپنا کیریئر بنانے کے خواہش مند ہیں۔ منظر نامہ ''میرے اپنے''، مشہور فلم ساز تپن سنہا کی بنگالی فلم ''اپن جن'' کی کہانی پر مبنی ہے۔

صفحات: 139، قیمت -/63 روپے

ماہ نامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔10، شمارہ۔5، مئی 2008

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103381, 26103938
26179657 فیکس: 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746, 26169416

شاخ: 22-7-110، قمر دفتر، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات .... ادارہ 5

زبان اور تعلیم

● اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف .... شمس الرحمن فاروقی 6
● جاپان میں اردو .... معین الدین عقیل 8
● مذکر مؤنث کی کج ادائیاں .... عارف وقار 12

ادب

● باقر مہدی — ایک نئے انداز کا فن کار .... ندا فاضلی 15
● حسرت موہانی — شاعری کی ریاست کا حزب مخالف .. ابوبکر عباد 20

شخصیات

● بابا فرید شکر گنج کا پیغام .... ارجمند آرا 26
● دودھ بھارتی کے معمار گوپال داس جی کی یاد میں .... رفعت سروش 29

سائنس اور ٹیکنالوجی

● ریڈیو کی کہانی اور آکاش وانی .... اقبال محی الدین 33
● ربڑ ٹیکنالوجی .... احسان اللہ احمد 37

کیریئر

● کال سینٹرز میں کیریئر .... علی معصوم رضا 41

ہماری مطبوعات سے

● عوامی ڈرامائی روایات .... محمد شاہد حسین 43
● بے سر کی تلاش .... سید محمد مہدی 49

اردو خبرنامہ .... ادارہ 51

تبصرہ و تعارف

● جامع تاریخ ہند .... ظفر احمد نظامی 71
● اتحاد سے انتشار کی طرف .... جاوید رحمانی ....
● افادات .... عبد الرب ....
● غالب اور ہماری تحریک آزادی .... محمد کاظم ....
● اقبال کے اردو کلام کی مبسوط فرہنگ .... ارشد عبد الحمید ....
● تفہیم و تاثر .... خورشید اختر ....

بچوں کا گوشہ

● آئین ہند کے معمار — بھیم راؤ امبیڈکر .... عبد السلام صدیقی 78

آپ کی بات

■ سید علیم اشرف جائسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد (اے۔ پی۔)

محترم فاروقی صاحب فرماتے ہیں کہ: فارسی لفظ ''تنہا'' بمعنی ''اکیلا'' میں ہا اصلی ہے یعنی ''تن'' بمعنی ''جسم'' کا لاحقہ نہیں ہے اور پھر ایک ہی جملے کے بعد مزید فرماتے ہیں: ''تنہا'' بمعنی ''اکیلا'' کی اصل نہیں معلوم۔ ظاہر ہے کہ جس لفظ کی اصل ہی نہ معلوم ہو، اس کے بارے میں تیقن سے، بغیر کسی مستقل عقلی یا نقلی دلیل کے، یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ اس... میں ہا اصلی ہے لاحقہ نہیں ہے، یا لاحقہ ہے اصلی نہیں ہے، کیونکہ اصل معلوم نہ ہونے کی صورت میں دونوں احتمال برابر ہیں۔ محترم فاروقی صاحب نے لفظ ''تنہا'' کی توجیہہ کرتے ہوئے برہان قاطع کے حوالے سے جو کچھ فرمایا ہے وہ ان کی دور رس اور دیدہ وری کی روایت کا ایک حصہ ہے اور اگر واقعتاً ''تنہا'' کی ہا اصلی نہیں ہے تو یہ ایک بے حد معقول و مقبول توجیہہ و تاویل ہوسکتی ہے، البتہ ان کا یہ فرمانا کہ: ہا کے ایک معنی ''اینک'' یعنی ایں = کا مخفف برہان قاطع میں درج ہے'' تو اس بیان میں مذکور لفظ ''مخفف'' غالباً سہو کاتب کا نتیجہ ہے اور اس کی جگہ پر ''مصغر'' ہونا چاہیے کیونکہ ''اینک'' فارسی زبان کے قاعدے کے مطابق اسم اشارہ ''ایں'' کی تصغیر ہے جیسے طفل سے طفلک وغیرہ۔ اردو میں لفظ ''تنہا'' کے ساتھ ایک لفظ اور بھی ہے ''تن تنہا''۔ اس کے معنی تقریباً وہی ہیں جو لفظ تنہا کے ہیں۔ تو کیا اس امکان و احتمال پر غور نہیں کیا جاسکتا کہ ''تنہا'' اصلاً ''تن تنہا'' ہی تھا، جو کثرت استعمال یا عدم توجہ کے سبب ''تنہا'' رہ گیا۔ ''لیکن یہ صرف قیاس ہے۔''

■ وحید واجد، شاہ عالم صاحب کمپاؤنڈ، رائچور۔ 584101

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ بیان کہ:

'''اصولی اعتبار سے'' خواب''، ''درخواست''، ''خوان''، ''خوانچہ''، ''خوش'' وغیرہ الفاظ میں واؤ کا وجود نہیں ہے۔'' اور ان کا یہ کہنا کہ:

''اب رہی بات کہ لفظ ''خواب''، ''خواجہ''، خوان'' وغیرہ میں جو واؤ ہے وہ تھوڑی بہت سننے میں آتی ہے اور وہ معدوم نہیں ہے تو بے شک بہت سے لوگوں کے تلفظ میں ''خواب'' وغیرہ الفاظ میں واؤ کی جھلک سنائی دیتی ہے۔ میں اسے علاقائی فرق سمجھتا ہوں اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔'' ناقابل تسلیم ہے۔ جھلک سنائی دینا بامحاورہ زبان نہیں ہے۔ ''خواب'' میں ''واؤ'' کی مدھم آواز کا ادا کرنا علاقائی نہیں بلکہ بنیادی طور پر اصولاً صحیح ہے، کیونکہ ''خواب'' میں ''واؤ'' دراصل ''واؤ اشمام'' ہے۔ ''واؤ'' سے قبل خائے مفتوح اور مابعد ''الف'' ہو تو اس کا تلفظ وہی ادا ہوتا ہے جس کے بارے میں محترم بزرگوار راج بہادر گوڑ صاحب نے عالمانہ تشریح فرمائی۔ ایسے الفاظ کی ادائیگی کے لیے تجوید اور مخارج زباں کے لحاظ سے ہونٹوں کو بغیر ملائے ضمہ کی ذرا سی آواز نکالی جاتی ہے جو نہایت خوش الحان اور دلنشیں ہوتی ہے۔ البتہ نظم میں چونکہ ''واؤ'' حروف علّت میں سے ایک ہے چنانچہ واؤ اشمام، واؤ معدولہ اور واؤ مجہول تقطیع میں شمار نہیں کی جاتیں۔ ماہرین عروض کے نزدیک ان کا اسقاط جائز و درست ہے۔ ''خواب'' نظم میں بلحاظ وزن ''باب'' ضرور ہے لیکن بلحاظ تلفظ اعراب مختلف ہے۔ اسی طرح خواجہ، خواہش، خوان، درخواست، خواندہ، خواہ وغیرہ میں واؤ کا وجود ہے اور اس کی حیثیت قواعد کی رو سے ''واؤ اشمام'' کی ہے جو اردو زبان کا جزو لاینفک ہے۔

■ شمس الرحمٰن فاروقی، C-29، ہسٹنگز روڈ، الٰہ آباد، یو۔ پی۔

لفظ ''تنہا'' کی اصل نہ معلوم ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہ نہیں معلوم کہ یہ لفظ کس زبان کا ہے، اور اگر قدیم تر فارسی (پہلوی) کا ہے تو پہلوی میں اس کی شکل کیا تھی؟ ان سوالوں کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ موجودہ صورت میں ''تنہا'' میں ''ہا'' اصلی ہے، لاحقہ نہیں ہے۔ ''تن تنہا'' میں ''تن'' کے بارے میں معلوم ہی ہے کہ اس کے معنی ''شخص، جسم، بدن'' کے ہیں اور ''تن تنہا'' مرکب توصیلی ہے۔ اس کا کوئی امکان نہیں کہ اصل میں ''تن تنہا'' تھا اور ''کثرت استعمال'' یا ''عدم توجہ'' کی بنا پر صرف ''تنہا'' رہ گیا۔ اور اگر ایسا ہے بھی تو اس سے ''تنہا'' کی اصل پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ جائسی صاحب کی یہ بات صحیح ہے کہ ''اینک'' کو ''ایں'' کی تصغیر کہنا چاہیے تھا نہ کہ تخفیف۔ ''برہان قاطع'' میں ''تصغیر'' ہی لکھا ہے، میں نے بے خیالی میں ''تخفیف'' لکھ دیا۔

■ جناب وحید واجد یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ''خواب'' وغیرہ میں واؤ معدولہ نہیں ہے۔ لہٰذا وہ ''واؤ اشمام'' کو بیچ میں لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''واؤ حروف علت میں سے ایک ہے، چنانچہ واؤ اشمام، واؤ معدولہ اور واؤ مجہول تقطیع میں شمار نہیں کی جاتیں۔'' اول تو یہ بات عجیب ہے کہ کوئی حرف اس لیے تقطیع میں نہ شمار ہو کہ وہ ''حرف علت'' ہے یا مجہول ہے، لیکن بحث یہاں تلفظ کی ہے، تقطیع کی نہیں۔ ہر ملفوظ حرف تقطیع میں شمار ہوتا ہے۔ کیا وحید واجد

صاحب کہہ سکتے ہیں کہ "خواب" وغیرہ میں واؤ ملفوظہ ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ اور اگر یہاں واؤ ملفوظہ نہیں تو وہ تقطیع میں نہ آئے گی، اس میں علمائے عروض اور اسقاطِ حرف کا حوالہ محض غلط بحث ہے۔ وحید واجد صاحب "واؤ اشمام" کی تعریف نہیں بیان کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ جہاں واؤ اشمام ہو وہاں "ہونٹوں کو بغیر ہلائے ضمہ کی ذرا سی آواز نکالی جاتی ہے جو نہایت خوش الحان اور دلنشیں ہوتی ہے۔" یہ تعریف محض ایجادِ بندہ ہے۔ انھیں شاید نہیں معلوم کہ واؤ معدولہ ہی کو واؤ اشمام کہتے ہیں۔ جو لوگ "خواب" جیسے الفاظ کا تلفظ Khwab کرتے ہیں وہ "خواب" کی واؤ کو واؤ اشمام کہتے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں یہاں واؤ کی ہلکی سی "بو" یا "مہک" (اشمام) ہے۔ جو لوگ "خواب" جیسے الفاظ کا تلفظ Khaab کرتے ہیں وہ اسے واؤ معدولہ کہتے ہیں۔ میں واؤ اشمام والے تلفظ کو علاقائی تلفظ کہتا ہوں اور اسے غلط نہیں کہتا۔ اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ جناب واجد فرماتے ہیں کہ "جھلک سنائی دینا" درست نہیں، تو پھر "بو سنائی دینا کیوں کر درست ہوا"

■ **یوسف ناظم، 19 الہلال، باندرہ ریکلمیشن، ممبئی-50**

"اردو دنیا" کا تازہ یعنی اپریل 2008 کا شمارہ اپنی صوری و معنوی خوبیوں سے معمور موصول ہوا۔ میں اس موقر رسالے کا پہلے ہی سے شیدائی ہوں اس مرتبہ میری شیفتگی دوبالا ہوگئی وہ یوں کہ تازہ شمارے میں "آپ کی بات" کا دلچسپ کالم "ہماری بات" کے کالم پر حاوی ہوگیا۔ یوں تو اس کالم کے سبھی خط لائقِ توجہ اور تحسین کے مستحق ہیں لیکن دو خطوں نے خاص طور پر اس کالم کی توقیر بڑھا دی۔ (کمال ہے یہاں بھی "افراطِ زر" در آیا) ایک خط اشفاق محمد خاں کا ہے جس سے مخدوم محی الدین کے "چنبیلی کے منڈوے تلے" کی مشامِ جاں کو معطر کردینے والی یاد تازہ ہوجاتی ہے اور دوسرا خط جناب جبار راجن کا ہے جو آنجہانی گپتا جی (مجاہدِ آزادی) کی خوش گوار اور دلپذیر یادوں سے مزین ہے۔ جبار راجن نے بے حد جذباتی اور مخلصانہ خط لکھا ہے اور اسے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا نمونہ بنا دیا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ "اردو دنیا" نے نہایت عمدہ مکتوب نگار بھی پیدا کیے ہیں تو آپ کو اس انکشاف پر خوش ہوجانا چاہیے۔

رسالے کے دوسرے مشمولات حسبِ معمول معلوماتی، علمی اور ادبی ہیں۔ ترقی اردو کونسل کے نئے وائس چیئرمین کا تعارف نامہ اور بزرگ ادیب و شاعر گلزار دہلوی کا علامہ دتاتریہ کیفی سے متعلق مختصر لیکن جامع مضمون دونوں آج کی ضرورت کی تکمیل کرتے ہیں۔ محترم چندر بھان خیال کا وائس چیئرمین کی حیثیت سے تقرر مرکزی وزیر ارجن سنگھ کے حسنِ انتخاب کی روشن مثال ہے۔ اس تقرر سے اس مسموم اور بے بنیاد خیال کی نفی ہوجانی چاہیے جس میں اردو جیسی ہند نژاد زبان کو صرف مسلمانوں کی زبان ہونے کی تشہیر کی گئی ہے۔ صفحہ 62 پر کونسل کے نئے وائس چیئرمین کے خیرمقدمی جلسے کی رپورٹ تو قند مکرر کے طور پر شائع کی جانے کے لائق ہے۔

آخر میں ایک انکشاف یہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اس رسالے نے اردو داں طبقے کے ذوقِ مطالعہ کی جہت بدل دی اور وہ افراد جو مشاعرے کے اسیر تھے اب معاشرے کی محفلوں میں ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ کہنے کے موقف میں ہیں۔ یہ لوگ سائنسی، نباتاتی، جماداتی اور ہر قسم کے موضوعاتی مضامین سے مستفید ہونے کے آرزومند ہوگئے ہیں۔ مبارک ہو!

محمد خلیل، شمیم احمد صدیقی اور فاروق احمد صاحبان کے قبیل کے اہلِ قلم سے مزید مضامین طلب فرمائیے۔ یہ طلب دوسرا کا معاملہ ہے۔

■ **شاغل ادیب، زیب منزل، 4-304/9/3، صدیق نگر، مشیر آباد، حیدرآباد-20 (اے۔ پی۔)**

"اردو دنیا" پابندی سے مل رہا ہے، شکریہ۔ تازہ شمارہ اپریل 2008 میں جناب پردیپ جین کی پیش کردہ پریم چند کی گمشدہ کہانی "آسمان کی پری" قابلِ قدر ادبی تحفہ ہے۔ یہ کہانی نہ تو اردو کی "کلیاتِ پریم چند" میں شامل ہے اور نہ ہی ہندی کی "پریم رچناولی" میں اور نہ ہی پریم چند کی نایاب و گم شدہ تخلیقات میں جو ماہنامہ "آج کل" کے شمارہ اکتوبر 2006 میں چھپی ہیں "آسمان کی پری" واقعی پریم چند لٹریچر میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ میں اس سلسلے میں آپ اور پردیپ جین صاحب کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں، کہ آپ کے توسط سے پریم چند کی ایک گمشدہ کہانی سے اردو دنیا متعارف ہوسکی۔ اس شمارے میں اظہار اثر کا مضمون "اردو کہانی — کل اور آج" بھی مختصر ہونے کے باوجود معلومات افزا ہے۔ "کرناٹک میں اردو نظم" کے عنوان پر محترمہ رفعت النسا بیگم کا مضمون (جو 'سب رس' حیدرآباد سے ماخوذ ہے) خوب ہے لیکن اس میں گلبرگہ کی شاعرہ ڈاکٹر صغریٰ عالم اور بیجاپور کے ڈاکٹر اقبال ہاشمی کی عدم شمولیت سے قدرے دکھ ہوا۔ دیگر تمام مشمولات بھی آپ کے حسنِ انتخاب اور کمالِ ادارت کے غماز ہیں۔ مبارکباد قبول فرمائیے۔

■ **سید رضوان احمد، 35 احمد گنج، ممتاز محل، الٰہ آباد (یو۔ پی۔)**

"اردو دنیا" کا تازہ شمارہ (جلد-10، شمارہ-4) نگاہوں کے سامنے ہے۔ دیدہ زیب سرورق کا جواب نہیں۔ شمارے کی تخلیقات اہم اور معلوماتی ہیں۔ جو آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس شمارے میں اظہار اثر صاحب کا ایک مضمون "اردو کہانی — کل اور آج" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں کئی غلطیاں ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں:

"ہنری فیلڈنگ (Henry Fielding) نے انگریزی میں پہلا ناول

لکھا تھا جو اٹھارہ حصوں یا جلدوں پر مشتمل تھا۔ اس ناول کا انداز ''الف لیلہ'' سے متاثر تھا... ہنری فیلڈنگ کی طرح پہلا ناول لکھنے کے لیے بوکاچیو (Boccaccio) کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ ہنری فیلڈنگ نے ''ٹوم جونس'' (Tom Jones) کے نام سے ناول لکھا تھا... بوکاچیو نے ''ڈیکامیرن'' کے نام سے ناول لکھا جو 1353 میں شائع ہوا تھا۔ تقریباً اسی زمانے میں ''ٹوم جونس'' بھی شائع ہوا تھا۔ ناول ڈیکامیرن کی کہانیاں بھی ''الف لیلہ'' اور ''کتھا ساگر'' سے متاثر تھیں۔''

موصوف نے ہنری فیلڈنگ اور بوکاچیو دونوں کو نہ صرف انگریزی کا پہلا ناول نگار لکھا ہے بلکہ دونوں کا زمانہ بھی تقریباً ایک ہی بتایا ہے یعنی جس زمانے میں ''ڈیکامیرن'' شائع ہوا اسی زمانے میں ''ٹوم جونس'' بھی شائع ہوا۔ پہلی بات تو یہ کہ بوکاچیو کی تصنیف ''ڈیکامیرن'' کی تاریخ اشاعت 1353 نہیں بلکہ اس کی تاریخ تصنیف 1350 ہے۔ (بوکاچیو کی تصنیف "DECAMERUN NOVELLA STORIA" کا نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں موجود ہے) اور ہنری فیلڈنگ کی تصنیف ''ٹام جونس'' کا سن اشاعت 1749 ہے۔ یعنی یہ ''ڈیکامیرن'' کی تصنیف کے تقریباً چار سو سال بعد شائع ہوئی۔ پھر دونوں کا زمانہ ایک کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ ''ڈیکامیرن'' ناول نہیں ہے اور نہ ہی اس پر ''الف لیلہ'' اور ''کتھا سرت ساگر'' کا کوئی اثر ہے۔ اس تصنیف کی نوعیت یہ ہے کہ فلورنس میں 1348 میں پلیگ کی وبا آئی جس میں کافی جانیں ضائع ہوگئیں۔ لوگ گھبرا کر اپنے گھر اور شہر چھوڑ کر بھاگنے لگے تھے۔ انھی میں سے سات نوجوان عورتیں اور تین مرد اپنے گھر چھوڑ کر قریب کے کسی گاؤں میں پناہ گزیں ہوئے۔ ان لوگوں کے پاس کوئی کام نہ ہونے کی وجہ سے فرصت ہی فرصت تھی۔ لہٰذا سب نے یہ طے کیا کہ ان میں سے کوئی ہر روز ایک قصہ سنائے۔ اس طرح سو کہانیاں ان لوگوں نے ایک دوسرے کو سنائیں، اسی لیے اس تصنیف کا نام ''ڈیکامیرن'' ہے جس کے معنی ہیں سو قصے۔

اظہار اثر صاحب کا کہنا ہے:

''لفظ ناول بھی بوکاچیو ہی نے اپنی کہانیوں کے لیے استعمال کیا تھا''

یہ قول بھی غلط ہے۔ اطالوی زبان کا لفظ ناول (Novel) نہیں ہے، Novella ہے جس کے معنی ہیں قصہ یا خبر۔ چودھویں صدی میں اٹلی میں Novella نام کی اصطلاح ضرور تھی مگر اس کے معنی تھے مختصر قصہ یا کہانی، اس کا تعلق موجودہ اصطلاح (Novel) ناول سے نہیں ہے۔

موصوف آگے فرماتے ہیں:

''الطاف حسین حالی نے ''مجلس النسا'' کے نام سے ایک ناول لکھا''

کتاب کا نام ''مجلس النسا'' نہیں ''مجالس النسا'' ہے۔ یہ ان کے قیام لاہور کے زمانے کی یادگار ہے جو عورتوں کی تعلیم اور تہذیب معاشرت کے لیے لکھی گئی تھی اور پنجاب کے مدارس نسواں کے نصاب میں شامل تھی۔ یہ ناول نہیں بلکہ افسانوی طرز کے مکالموں اور بیانیوں کا مجموعہ ہے۔

■ فیروز ہاشمی، چمن بھون، یحییٰ نگر، نئی دہلی-110047

ماہ مارچ 2008 کا ''اردو دنیا'' اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ الحمدللہ یہ ماہنامہ روز بروز نکھرتا جارہا ہے۔ یہ اردو کے بیشتر موضوعات کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کررہا ہے۔ زبان، فکروفن اور دیگر موضوعات کے لحاظ سے بھی پر اثر ہوتا جارہا ہے۔ محترم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا مستقل کالم ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' شائقین اردو کے لیے کافی کارآمد ثابت ہورہا ہے، خاص طور سے اساتذہ و طلبہ کے لیے۔ اس شمارے میں جناب مشتاق احمد کا مضمون ''اردو: عالمی لسانی تناظر میں'' چشم کشا ہے۔ انھوں نے بہت ہی اہم امور کی جانب توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔

یقیناً ہماری گفتگو ہماری تہذیب کی شناخت ہونی چاہیے لیکن کیا سچ مچ میں "Speech is part of our cultural indentify" ہے؟ الفاظ کے صحیح مخارج سے ہماری نئی نسل بے بہرہ ہے۔ املا کی غلطیاں عام ہوچکی ہیں۔ چند سال قبل جاج مئو کانپور کے ایک صاحب کا خط ملا جس میں اپنا نام انھوں نے اردو میں ''آرف انساری'' لکھا تھا۔ جب ان سے دہلی میں ملاقات ہوئی تو میں نے ان کی توجہ دلائی تو ان کا جواب تھا: سننے میں تو ایک ہی طرح کا لگتا ہے، ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ جب اس طرح کے لوگ اردو پڑھانے پر مامور کیے جائیں گے تو اردو کتنی ترقی کرے گی اور اردو میں دیگر علوم کیسے پڑھائے جاسکیں گے؟

■ جلیل عشرت، آر. بی. منزل، جہانگیر محلہ، آسنسول-713302

''اردو دنیا'' پابندی سے پڑھ رہا ہوں۔ اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ ہے۔ ''آپ کی بات'' اور ''ہماری بات'' پڑھ کر جانکاری حاصل ہوتی ہے اور مزہ بھی آتا ہے۔ مشمولات کے سلسلے میں بھی یہ بات بلاتکلف کہی جاسکتی ہے کہ آپ صرف علمی اور معیاری نگارشات ہی کو جگہ دیتے ہیں۔ ساتھ ہی صحافتی بصیرت کا بھی نقش چھوڑتے ہیں۔ بیشک آپ حضرات کی مساعی جمیلہ سے ''اردو دنیا'' آسانی سے اہل نظر تک پہنچ رہا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ یہ درخشاں ستارہ اسی آب و تاب کے ساتھ ادبی افق پر چمکتا رہے۔

□□□

ہماری بات

علم کے فروغ اور انسانی ذہن کے ارتقا کے لیے یہ ضروری ہے کہ مختلف زبانیں بولنے والے ان زبانوں میں دستیاب علمی اور ادبی ذخیرے سے واقف ہوں اور حسبِ توفیق اس سے مستفید بھی ہوں۔ اس عمل کو آگے بڑھانے میں ترجمے کو کلیدی اہمیت حاصل ہے چنانچہ جب سے انسانی تہذیب وجود میں آئی ہے، ترجمے کا عمل بھی جاری ہے اور ساری علمی ترقیاں ایک حد تک اسی عمل کی مرہونِ منت ہیں۔

ہندوستان بہت سی زبانوں کا گہوارہ رہا ہے جن میں ان زبانوں کے علاوہ جو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئیں اور یہیں پھولیں پھلیں، کچھ بیرونی زبانیں بھی شامل ہیں۔ بیرونی زبانوں میں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں سے ہندوستان کے رشتے بہت پرانے ہیں چنانچہ ان زبانوں کے علمی ادبی خزانے بہ کثرت ہندوستانی زبانوں میں منتقل ہوتے رہے ہیں۔ اردو جو ہندوستان کی نسبتاً نوعمر زبانوں میں ہے، اس میں بھی کثیر تعداد میں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کی مختلف النوع کتابوں کے ترجمے ہوتے رہے ہیں۔ یہ عمل آج بھی جاری ہے اگرچہ بدلے ہوئے حالات کے زیر اثر اس کی رفتار اب سست ہوگئی ہے۔ اب ان کی جگہ انگریزی، روسی اور فرانسیسی زبانوں نے لے لی ہے جو موجودہ دور کی مقتدر زبانیں کہی جاتی ہیں۔

ابتدا میں ترجمے کا عمل زیادہ تر انفرادی سطح پر ہوتا تھا جو علم و ادب کے شائقین اپنے اپنے طور پر انجام دیتے تھے، اگرچہ اس عمل میں مختلف ادوار میں حکومتوں کی دلچسپی کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ ترجمے کو ایک باضابطہ فن کا درجہ دینے کی پہلی کوشش ہندوستان میں انگریزوں کے قائم کردہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ نے کی۔ اس کالج کے قیام کے مقاصد مختلف النوع تھے جو بڑی حد تک سامراجی مفادات کے بھی تابع تھے، لیکن وہاں بہت سی اہم کتابوں کے اردو اور ہندی میں ترجمے ہوئے اور کالج نے انھیں شائع بھی کیا۔ دوسری کوشش حیدرآباد میں ہوئی جہاں نظام کے قائم کردہ دارالترجمہ میں علمی اصطلاحات کے ترجمے کا کام بھی ہوا۔ دارالترجمہ کی تیار کردہ فرہنگ اصطلاحات اس سمت میں ایک اہم پیش رفت تھی لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ حیدرآباد کی اس وقت کی تہذیبی فضا میں عربی اور فارسی زبانیں بہت زیادہ رچی بسی تھیں اور کچھ اس وجہ سے کہ اس کام پر مامور اکثر وہ لوگ تھے جن کا اوڑھنا بچھونا یہی زبانیں تھیں؛ وہاں جو اصطلاحات وضع کی گئیں یا بعض الفاظ کے جو ترجمے کیے گئے وہ کچھ زیادہ ہی گاڑھے ہوگئے۔ مثلاً لاؤڈ اسپیکر کا ترجمہ آلۂ مکبر الصوت کیا گیا۔ اس طرح کے لفظی ثقیل ترجمے ظاہر ہے رواج عام کی سند نہیں پا سکتے تھے۔

قومی اردو کونسل بھی علمی اصطلاحات کے تراجم کو اہمیت دیتی رہی ہے اور اس نے اس کام کے لیے وقفے وقفے سے متعدد اہل علم کی خدمات حاصل کی ہیں۔ اردو کونسل نے ان اصطلاحات کے مترادف تیار کرنے پر خصوصی توجہ کی ہے جو درسی کتابوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ کونسل نے جو ہدف مقرر کیے ہیں، وہ سب ابھی حاصل نہیں کیے جا سکے ہیں لیکن اس سمت میں پیش رفت کا عمل تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔

ترجمے کی اہمیت اور افادیت پر مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی حیدرآباد اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں بھی پچھلے دنوں دو سیمینار ہوئے جن میں ترجمے کے عمل کے مختلف مراحل اور ان مراحل سے گزرتے ہوئے جو مشکلیں پیش آتی ہیں، ان کی نشاندہی بھی کی گئی اور ان مشکلوں پر قابو پانے کے طریقوں پر بھی غور کیا گیا۔ جامعہ کا سیمینار تین دن کا تھا اس لیے شرکا کو ہر پہلو پر تفصیل سے اظہار خیال کا موقع ملا اور بہت سی اہم تجویزیں سامنے آئیں۔

ہمارا خیال ہے کہ ادبی تخلیقات کے ترجمے میں لفظی ترجمہ ضروری نہیں، اس میں اپنی زبان کے ادبی مزاج اور اس کی جمالیات کی رو سے بہ قدر وسعتِ زنجیر ہی سہی، آزادی لی جا سکتی ہے، تاکہ جب وہ قارئین تک پہنچے تو وہ اجنبیت محسوس نہ کریں۔ لیکن علمی تراجم میں اس نوع کی آزادیوں کی گنجائش نہیں نکالی جاسکتی۔ ہاں یہ احتیاط ضروری ہے کہ اصل اصطلاحات کے متبادل کے طور پر جو اصطلاحات وضع کی جائیں وہ زیادہ مشکل نہ ہوں اور صوتی اعتبار سے بھی ان میں ثقالت نہ ہو، زبانوں پر آسانی سے چڑھ سکیں۔ جو اصطلاحات وضع کی جائیں انھیں مشتہر بھی کیا جانا چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ اہل علم انھیں پرکھ سکیں اور ان کے حسن و قبح پر اظہار خیال کر سکیں۔ جن اصطلاحات پر عام اتفاق رائے ہو جائے انھیں مستند مان کر ان کے استعمال کو لازمی قرار دیا جائے تاکہ اس ضمن میں پایا جانے والا موجودہ انتشار ختم ہو۔

مغربی زبانوں کے جو لفظ یا جو اصطلاحات اردو میں اپنی اصل یا کچھ بدلی ہوئی شکل میں رواج پا چکی ہیں اور بے تکلفی سے زبانوں پر رواں ہیں، ان کے مترادفات تلاش کرنا اور ان مترادفات کو رواج دینے کی کوشش کرنا، غیر ضروری ہی نہیں غیر مناسب بھی ہوگا۔ اردو نے عربی اور فارسی الفاظ کی طرح مغربی زبانوں کے بہت سے الفاظ کو بھی جوں کا توں یا تلفظ کی تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ قبول کرلیا ہے، انھیں اسی طرح باقی رکھنا چاہیے۔ □□□

شمس الرحمٰن فاروقی

اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف

سوال: اردو زبان دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہے، لیکن اردو کی گنتیاں بائیں سے دائیں لکھی جاتی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

جواب: اس سوال کا جواب تو کوئی ماہر ریاضیات ہی دے سکتا ہے۔ بہر حال، جہاں تک مجھے معلوم ہے، گنتیوں کا یہ طریقہ ہندوستان سے عربوں نے حاصل کیا اور عربوں کے ذریعے یورپ اور دوسرے ممالک میں پھیلا۔ اسی لیے یہ گنتیاں Indian Numerals اور Arabic Numerals کہلاتی ہیں۔ ہندوستان میں گنتیاں چونکہ بائیں سے دائیں لکھی جاتی تھیں (اور ہیں)، لہٰذا یہی طریقہ سب نے اختیار کیا۔

(سوال از پروفیسر سید اطہر رضا بلگرامی، نور نگر، اوکھلا، نئی دہلی)

سوال: ''قدر و قیمت'' کے معنی اور محل استعمال کیا ہیں؟

جواب: اس فقرے میں ''قدر'' اور ''قیمت'' ہم معنی ہیں اور پورے فقرے کے معنی ہیں: ''توقیر، منزلت''، جیسا کہ میر کے شعر میں ہے:

قدر و قیمت اس سے زیادہ میر تمھاری کیا ہوگی
جس کے خواہاں دونوں جہاں ہیں، اس کے ہاتھ بکاؤ تم

سوال: ''مہرونی'' کے معنی اور محل استعمال بتائیں۔ نواز دیوبندی کا شعر ہے:

بیٹی کی ضد کے آگے ماں چپ ہو جاتی ہے لیکن
ننگے سر کی مہرونی پر آنچل رونے لگتا ہے

جواب: ''مہرونی'' مجھے کسی اردو لغت میں نہ ملا۔ ہندی کے سب سے بڑے لغت ''شبد ساگر'' میں بھی نہیں ہے۔ یہ کوئی مقامی لفظ معلوم ہوتا ہے شاعر بہتر جانتا ہے، اسی سے پوچھیے۔

سوال: غالب کا مصرع ہے:

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں

''توسن'' کے معنی کیا ہیں؟

جواب: ''توسن'' کے معنی ہیں ''گھوڑا''، خاص کر تیز دوڑنے والا شوخ گھوڑا۔ لیکن اردو میں ''گھوڑا'' کے عمومی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔

سوال: ''مرہون منت'' کے معنی اور محل استعمال کیا ہیں؟

جواب: ''منت'' بمعنی ''احسان، مہربانی'' ہے۔ اور ''مرہون'' کے معنی ہیں، ''رہن رکھا ہوا''۔ لہٰذا آپ کسی شخص کے بہت احسان مند ہیں، یا اس کے تئیں بہت احسان مندی ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو آپ کہہ سکتے ہیں، ''میں آپ کا مرہون منت ہوں۔''

(سوالات از محمد صدر عالم، دربھنگہ)

سوال: آپ کا خیال ہے ''اسٹیشن'' بروزن مفعولات صحیح ہے۔ میرا خیال ہے اسے بروزن مفعولن کہنا درست ہوگا۔

جواب: اگر میں نے ''اسٹیشن'' کو بروزن مفعولات کہا تو یا تو یہ میرا سہو ہے یا سہو کاتب ہے۔ ''اسٹیشن'' بروزن مفعولن ہی درست ہے۔

سوال: فی صدی درست ہے یا فی صد؟

جواب: دونوں صحیح ہیں، لیکن بعض فقروں، مثلاً ''صد فی صد''، کی جگہ ''صدی فی صدی'' نہیں کہہ سکتے۔

سوال: ''پتھر'' کے لیے ''کاٹنا''، ''گھٹنا''، ''ٹوٹنا'' کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: سیاق و سباق کا تقاضا ہو تو سبھی صحیح ہیں۔ مثلاً سنگ تراش پتھر کاٹتا ہے۔ ہوا اور پانی کے زور سے پتھر گھٹ کر مٹی کا ڈھیلا بن جاتا ہے۔ زور کی چوٹ پڑنے پر ہیرے جیسا سخت پتھر بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

(سوالات از محترمہ ایس نسیم، شب پور، ہوڑہ)

سوال: ''عادتی'' صحیح ہے یا ''عادی''؟

جواب: اردو میں ''عادتی'' نہیں ہے۔ ''عادی'' اردو میں ہے لیکن بعض لوگ اسے غلط کہتے ہیں، کیوں کہ عربی میں ''عادۃ'' سے ''عادی'' نہیں بن سکتا۔ لیکن اردو کے جمہور ''عادی'' ہی لکھتے بولتے ہیں اور اردو میں یہی صحیح ہے۔

سوال: ''وحشی'' صحیح ہے یا ''وحشی''؟

جواب: ''جنگلی''، یا ''غیر مہذب''، یا ''شہری کا نقیض'' کے معنی میں ''وحشی'' بالکل صحیح ہے۔ ''دہشت رکھنے والا، وحشت سے متعلق'' کے معنی میں ''وحشی'' بھی صحیح ہے، لیکن اردو فارسی میں دیکھا نہیں گیا، سوا اس کے کہ ایک فارسی شاعر وحشی تخلص کا ضرور تھا۔

سوال: ''استحصال'' صحیح ہے یا ''استیصال''؟

جواب: دونوں صحیح ہیں۔ ''استحصال'' فارسی والوں نے عربی اصل ح ص ل سے بنا لیا ہے، بمعنی ''حاصل کرنا''۔ اردو میں اس کے معنی ہیں ''دوسرے کا مال بزور حاصل کرنا''۔ یعنی اردو میں یہ Exploitation کے معنی میں رائج ہے۔ اور ''استیصال'' کی اصل ہے اص ل۔ اس کے معنی ہیں ''جڑ

سے اکھاڑ دینا''، لہٰذا ''کسی چیز کو بالکل ختم کر دینا''۔ اردو میں عام طور پر یہ بری چیزوں کے لیے آتا ہے۔

سوال: الفاظ سازی یا اصطلاح سازی کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب: یہ سوال میرے دائرے سے باہر ہے۔ بہر حال، جواب یہ ہے کہ سنسکرت اور عربی میں ہر لفظ کی ایک اصل (Root) مقرر ہوتی ہے۔ اس سے مختلف طریقوں سے لفظ بنائے جاسکتے ہیں۔لیکن ہر طریقہ ہر جگہ نہیں لگتا۔ مثلاً یہی دیکھیے کہ (Root) اص ل سے ''استیصال'' (اصل میں استئصال) بروزن استفعال بن سکتا ہے،لیکن (Root) ح ص ل سے ''استحصال'' بروزن استفعال نہیں بنتا۔ اصطلاح سازی کے کوئی اصول نہیں ہیں۔ مولانا وحید الدین سلیم نے اپنی قابل قدر کتاب ''وضع اصطلاحات'' میں قاعدے بنانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ مقبول نہ ہوئی۔

(سوالات از واحد حسین صدیقی، میڈیکل روڈ، علی گڑھ)

سوال: لفظ ''اساطیر'' کیسے بنا اور اس کے معنی اور محل استعمال کیا ہیں؟

جواب: عربی لفظ ''اسطور/ اسطورہ'' کی جمع ''اساطیر'' اردو میں ''دیومالا'' یعنی Myth کے معنی میں مستعمل ہے۔ضرورت پڑنے پر واحد کی شکل میں ''اسطور/ اسطورہ'' بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ فارسی میں ''اسطورہ/ اساطیر'' جھوٹے قصوں وغیرہ کو کہتے ہیں،لیکن عربی میں یہ صرف قصہ، کہانی، Fable وغیرہ کو کہتے ہیں۔

(سوال از نوید عبدالجلیل، ظہیر آباد، میدک)

□□□

فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیاتِ میر (مطبوعہ 1811) کے بعد کلامِ میر کا صحیح ترین اور مکمل ترین نسخہ

کلیاتِ میر (دو جلدوں میں)

جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) صفحات: 870● قیمت 402 روپے مجلد، 336 روپے غیر مجلد ● سائز: 20X26X8

مرتب: ظل عباس عباسی ● بہ تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

جلد دوم (قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) صفحات: 632● قیمت 430 روپے مجلد، 410 روپے غیر مجلد

تحقیق و ترتیب: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

- اس نسخے کو تمام اہم اور قابل ذکر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔
- کلام میر میں مستعمل بے شمار نادر اور نامانوس الفاظ کی صحت و درستی کو بڑی حد تک یقینی بنایا گیا ہے۔
- نسخۂ عباسی جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اس میں نسخۂ محمود آباد سے بہت سارا کلام لے کر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب جلد اول میں غزلیات کی کل تعداد 1916 ہے جو ابھی تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہے۔ غزلیات میں اشعار کی کل تعداد 13908 ہے۔
- جلد دوم میں میر کے تمام مرثیوں کو پہلی بار پوری صحت کے ساتھ مکمل صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔
- جلد دوم میں منظومات کو پہلی بار بالکل نئی، مناسب اور بااصول ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس طرح نسخے میں شامل کسی بھی منظومے کو تلاش کر لینا آسان ہوگیا ہے۔
- دونوں جلدوں میں متن کی تصحیح کے دوران مختلف مستند اور بعض نادر لغات اور فرہنگوں کا سہارا لیا گیا ہے۔
- جلد دوم میں دو تفصیلی دیباچے شامل ہیں۔ احمد محفوظ کے دیباچے میں کلام میر کی تدوین و تصحیح متن سے متعلق نہایت اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچے میں مثنویات میر اور میر کے عمومی کلام پر ایک بالکل نئے پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔
- جلد اول میں دیگر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نما ایک نیا مضمون ''تمہید'' کے عنوان سے شامل ہے۔
- ان دونوں جلدوں کو بڑے سائز پر سفید کاغذ اور عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور سرورق ایسا ہے جو میر کے زمانے کی تہذیبی و ثقافتی روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیات میر (جلد اول و دوم) ملک کے تمام بڑے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ اردو کونسل سے براہ راست بھی طلب کی جاسکتی ہے۔

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

معین الدین عقیل

جاپان میں اردو

یادش بخیر، جاپان میں اردو زبان کی باقاعدہ تدریس کی روایت سو سال سے زیادہ عرصے پر محیط ہے اور ادب کے مطالعے کی مستحکم روایت بھی تین چوتھائی صدی سے کم نہیں۔ راقم الحروف قبل ازیں سات سال تک ''ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز'' اور ساتھ ہی ''وائی تو ہنگا یونیورسٹی'' میں اور مزید اسی آخر الذکر یونیورسٹی میں ''وزیٹنگ فیلو'' کی حیثیت سے اردو زبان و ادب کی تدریس اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ و ثقافت کے موضوعات پر یہاں کی دیگر یونیورسٹیوں کے اسکالرز کی تحقیقات و مطالعات میں معاونت کا فریضہ انجام دیتا رہا ہے۔ اس عرصے میں جاپان میں اردو زبان و ادب اور ساتھ ہی اسلام اور اسلامی دنیا کے تعلق سے ہونے والے تحقیقاتی اور مطالعاتی کاموں سے، جن سے اردو کے قاری بہت کم واقف رہے ہیں، کراچی کے ہفت روزہ جریدے ''تکبیر''، میں ''مشرق تاباں'' کے زیر عنوان اپنے مستقل شذرات کے ذریعے اردو دنیا کو متعارف کراتا رہا ہے۔ اب راقم الحروف کا جاپان میں یہ تیسرا قیام ہے، جس کا بنیادی مقصد فی الوقت اردو زبان کی عالمی سطح پر بذریعہ کمپیوٹر تدریس کے لیے ضروری مواد بصورتِ نصاب فراہم کرنا ہے اور اس طرح Urdu on Line کو عام کرنا ہے تاکہ جاپان، یورپ، امریکہ اور جہاں جہاں اردو زبان کی تدریس اور سیکھنے کے رجحان میں جو روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اس کے لیے ایک معیاری اور مناسب نصاب اور اس کی مشقیں خواہش مندوں اور ضرورت مندوں کو میسر آ جائیں۔ غالباً یہ اپنی نوعیت کا اولین نصاب ہوگا اور اولین کوشش ہوگی جو ''اوساکا یونیورسٹی، جاپان'' میں عین اس مقصد کے لیے نو تشکیل شدہ ادارے ''ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف ورلڈ لینگویجز'' کے زیر اہتمام کی جا رہی ہیں۔

یہ اردو زبان کی اہمیت، افادیت اور خوش قسمتی ہے کہ جس کے باعث اولاً جن زبانوں کو اس مقصد کے لیے منتخب کیا گیا ہے ان میں فرانسیسی اور ہسپانوی کے ساتھ اردو شامل ہے۔ باقی زبانیں، بشمول ہندی، بعد میں رفتہ رفتہ منتخب کی جاتی رہیں گی۔ اس مرحلے پر، اس مناسبت سے یہ اردو کے لیے اور اس تعلق سے خود راقم الحروف کے لیے ایک دعوتِ مقابلہ ہے۔ اس کام کے لیے جو وقتی ہدف ادارے نے طے کیا ہے اس کے مطابق ساری کاغذی کارروائی اور عکس بندی وصدا بندی کا مرحلہ چھ ماہ میں یعنی جو اس اکتوبر سے شروع ہوا ہے اس اگلے سال مارچ کے اختتام تک مکمل ہوگا، ان شاء اللہ پورا ہو جائے گا۔ بعد میں فنی مراحل اور نوک پلک کے درست کیے جانے کا کام ہوتا رہے گا، جس کی تکمیل کے بعد اردو بذریعہ کمپیوٹر عالمی نشریے میں شامل ہو جائے گی۔

سات سال قبل تک کہ جب یہاں مارچ 2000 میں راقم الحروف کے قیام کا اولین عرصہ مکمل ہوا تھا، یہاں اردو زبان و ادب کے ذیل میں جو جو اہم کام ہوتے رہے اور منظر عام پر آتے رہے ہیں، ان کا ذکر اور تعارف مذکورہ بالا ''مشرق تاباں'' میں ہوتا رہا ہے۔ 2000 یا اس کے بعد جو کام یہاں سامنے آئے ہیں، زیر نظر سطور میں ان کا سرسری سا حوالہ مقصود ہے۔

زبان کے تعلق سے یہاں حالیہ عرصے میں تین نمایاں کام ہوئے ہیں ان میں سب سے اہم ''اردو — جاپانی لغت'' ہے، جو یہاں اردو زبان و ادب اور اسلامیات کے نامور اسکالر اور استاد پروفیسر کان کاگایا کی برسہا برس کی شبانہ روز محنت کا نتیجہ ہے، اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ فاضل لغت نویس نے تمام الفاظ راست متون سے بذاتِ خود اخذ کیے، ان کے کارڈ بنائے، ان کی مثالیں اور ان کے استعمال تلاش کیے اور پھر انھیں لغت کے مقررہ اصولوں کے تحت ترتیب دیا۔ ان کے اس کام میں انھیں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی بھی معاونت حاصل رہی ہے۔ پروفیسر کاگایا پاکستان کے علمی حلقے کے لیے ربع صدی قبل تک غیر معروف نہ تھے، کیونکہ وہ کچھ عرصے پنجاب یونیورسٹی سے بھی منسلک رہے، یہاں کی کانفرنسوں میں بھی شرکت کے لیے مدعو ہوتے رہے اور حکومت پاکستان نے انھیں بجاطور پر تمغۂ امتیاز بھی عطا کیا۔ مگر دو تین دہائیوں سے کاگایا صاحب فنافی اللغت ہو کر رہ گئے تھے، تب ہی یہ ایک وقیع اور لائق تحسین کام مکمل ہو سکا، جس کی نظیر، غیر زبانوں میں، انگریزی سے قطع نظر، شاید تلاش نہ کی جا سکے۔ آج کل پروفیسر کاگایا صاحب اوساکا یونیورسٹی سے سبکدوش ہو کر اپنے آبائی شہر کوبے میں فراغت کی زندگی گزار رہے ہیں۔

اسی نوعیت کا ایک اور وقیع کام یہاں کے ایک اور اردو کے قابل احترام استاد پروفیسر سوزوکی تاکیشی نے انجام دیا ہے اور وہ بھی ایک ایسی ہی ضخیم اردو — جاپانی لغت کی ترتیب ہے، جو ان کی بھی برسہا برس کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ قبل ازیں پروفیسر سوزوکی صاحب نے ایک ''اردو — جاپانی لغت'' بنیادی الفاظ پر مشتمل مرتب کی تھی اس کی ترتیب میں انھیں ٹوکیو یونیورسٹی کے پروفیسر اوساوا یوتاکا کی معاونت بھی حاصل تھی اور جو جیبی سائز میں اب تک یہاں کے طالب علموں کے عام استعمال میں ہے لیکن اب یہ ضخیم لغت، ایک مکمل اور جامع لغت ہے، جو بد قسمتی سے سوزوکی صاحب کی خواہش اور کوشش کے باوجود ان کی زندگی میں مکمل یا شائع نہ ہو سکی تھی۔ اسے ان کے لائق شاگرد پروفیسر ہاگیتا

نے جو ان کے اس وقیع کام میں ان کے شریک اور معاون تھے، اس کی حتمی تکمیل اور اشاعتی مراحل مکمل کرلیے ہیں اور اب قوی امکان ہے کہ یہ چند ماہ میں شائع ہوجائے۔ اس طرح جاپان میں اردو کے دو اہم عصر جاں نثاروں کی یہ کاوشیں اردو لغت نویسی کی وسیع تر تاریخ کی نمایاں اور قابل قدر مثالیں ثابت ہوں گی۔

پروفیسر سوزوکی نے، جنھیں اب مرحوم کہتے ہوئے دل دکھتا ہے، اردو زبان اور ادب کی ترقی کے لیے خدمات یہاں انجام دی ہیں، ان کی کوئی نظیر نہیں۔ لغت نویسی میں ان کا ایک اور وقیع کام ''جاپانی— اردو لغت'' بھی ہے جو یہاں اس نوع کی واحد مثال ہے اور یہ بڑی حد تک یہاں کے طلبہ کی ضرورت پوری کررہی ہے۔ اردو قواعد بھی سوزوکی صاحب کا خاص میدان رہا اور یہاں اردو تدریس کے لیے ان کی تالیف کردہ ''اردو قواعد'' نصاب، اردو کی تدریس اور طلبہ کی تمام ضرورتیں پوری کرتی ہے۔ ادب کے تعلق سے سوزوکی صاحب نے جو کام یہاں کیے اور اس کے فروغ کے لیے یہاں ان کی جو خدمات ہیں، ان کا ایک سرسری احوال راقم الحروف کے ایک مضمون میں دیکھا جاسکتا ہے، جو ''دریافت'' کے شمارہ دوم میں شائع ہوا پھر ان کی اس ذیل میں ضروری خدمات کا ذکر راقم نے ''مشرق تاباں'' کے تحت بار ہا کیا ہے۔

اردو لغت نویسی کے اس کام کو، جو سوزوکی نے انجام دیا تھا، یہاں حتمی نہیں کہا جاسکتا۔ سوزوکی صاحب کے ساتھ ساتھ اس جانب اوساکا یونیورسٹی میں اردو کے استاد پروفیسر ماتسومورا نے آگے یا تکمیل کی جانب قدم بڑھایا ہے اور ایک مزید جامع ''ابتدائی قواعد اردو'' تالیف کی ہے، جسے انکساری میں انھوں نے ''ابتدائی'' قرار دیا ہے، لیکن واقعتاً یہ جامع اور مکمل ہی ہے۔ عاجزی، انکساری اور فروتنی یہ جاپانیوں کے عام اور مشترکہ اوصاف ہیں جن سے کوئی بچا ہوا نہیں ہے۔ پروفیسر ماتسومورا نے قواعد کے تعلق سے یہاں یہ ایک بڑا کام کیا ہے جسے پروفیسر سوزوکی صاحب کے کام کی ایک جامع اور زیادہ مکمل صورت کہا جاسکتا ہے اور یہ یہاں اردو سیکھنے، پڑھنے والوں کے لیے ایک بنیادی وسیلہ کہا جاسکتا ہے۔

اگرچہ پروفیسر ماتسومورا نے ادب اور خصوصاً شاعری کو اپنے مطالعات و تراجم کو زیادہ موضوع بنایا ہے، لیکن ''قواعد'' کی تالیف کے علاوہ زبان کے تعلق سے ان کے اور کام بھی توجہ کے لائق ہیں۔ ان کے ایک رفیق کار پروفیسر سویاما نے، جن سے لاہور اور اسلام آباد کے ادبی حلقے خوب متعارف ہیں، 2003 میں ایک بہت مفید اور دلچسپ کتاب، جاپانی زبان میں، جاپانیوں کے لیے'' پاکستان کو جاننے کے لیے 60 مقالات'' مرتب کی تھی، جس میں متنوع عنوانات کے تحت پاکستان کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت پر تعارفی نوعیت کے مقالات شامل کیے تھے جو یہاں کے متعدد اہل قلم نے تحریر کیے تھے، جو پاکستان کے بارے میں خوب واقفیت بھی رکھتے ہیں اور اردو اور پاکستان کے بارے میں لکھتے پڑھتے بھی ہیں۔ پروفیسر ماتسومورا نے اس مجموعۂ مقالات میں اردو کے بحیثیت قومی زبان ہونے پر اپنا مقدمہ تحریر کیا ہے، جس کا لب لباب یہ ہے کہ اردو چونکہ قوموں کو جوڑے رکھنے والی ایک زبان ثابت ہوئی ہے اور یہ ایک بین اللسانی زبان بھی ہے اس لیے یہ پاکستان میں ایک قومی زبان کا درجہ اور حیثیت رکھتی ہے۔ یہ مجموعہ مقالات 2003 میں اوساکا سے شائع ہوا ہے۔

زبان کے تعلق سے پروفیسر ماتسومورا نے اردو کو دیگر موضوعات کے تحت بھی موضوع بنایا ہے۔ ان کا ایک مقالہ جو اگرچہ محمد حسین آزاد کی تصنیف ''آب حیات'' کے مقدمے کا ایک تجزیاتی مطالعہ ہے، لیکن یہ موضوعاتی طور پر آزاد کے اصلاح زبان اور اردو شاعری کے تصور کے حوالے سے ہے۔ اسی عرصے میں انھوں نے ''دہلی، لکھنؤ اور اردو زبان'' کے عنوان سے بھی ایک مقالہ لکھا، جو ان دونوں دبستانوں کی زبان کے فرق اور اس کے تقابلی مطالعے اور تجزیے پر مبنی ہے۔ ان کے یہ دونوں مقالے'' اوساکا یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز'' کے تحقیقی مجلے میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ مجلّہ گاہے گاہے موضوعاتی حوالے سے بھی شائع ہوتا ہے۔ اس کا ایک شمارہ (2006) ''جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا ربط باہمی'' کے موضوع کے تحت منعقدہ ایک سیمینار میں پیش کیے گئے مقالات پر مشتمل ہے جس میں اردو میڈیا کو مرکزی نکتہ قرار دے کر یہ غور کیا گیا ہے کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو باہمی طور پر مربوط رکھنے کے لیے اردو ذرائع ابلاغ نے کیا کردار ادا کیا ہے؟ یہ ایک نہایت اہم موضوع پر ایک مفید سیمینار تھا جس میں پروفیسر ماتسومورا نے انگلستان سے نکلنے والے اردو اخبارات وصحائف کے توسط سے یہ موضوع اپنے اظہار خیال کے لیے منتخب کیا تھا۔ ان کا یہ مقالہ انگلستان میں اردو ذرائع ابلاغ کے رویے اور مزاج کی عکاسی کرتا ہے اور اس کے تجزیاتی جائزے پر مبنی ہے۔

اس سیمینار میں پروفیسر یامانے، نے اردو ذرائع ابلاغ اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں ربط باہمی کے موضوع کے حوالے سے شمالی یورپ کے ذرائع ابلاغ کو موضوع بنایا تھا۔ اس مطالعے و جائزے میں انھوں نے نہ صرف اخبارات وصحائف کو پیش نظر رکھا بلکہ اشتہارات اور کتابچوں کو بھی بطور حوالے کے استعمال کیا ہے۔ یامانے صاحب بہت وسیع المطالعہ اور کثیر العلم ہیں اور آج کے جاپان میں شاید سب سے زیادہ لکھنے اور پڑھنے کے کاموں میں سرگرم اور مستعد ہیں۔ پھر ان کے موضوعات بھی محدود نہیں۔ مذہب، سیاست، تاریخ، افکار اور زبان و ادب یہ سب ان کے موضوعات دلچسپ ہیں اور یہ ہر ایک میں یہاں پیش پیش، متحرک اور فعال بھی ہیں۔ زبان کے تعلق سے بھی ان کے کام مستند اور متنوع ہیں۔ اوساکا یونیورسٹی کے تحقیقی مجلے کے یہ مدیر بھی ہیں اور پھر کئی مجموعۂ مقالات بھی انھوں نے مرتب کیے ہیں۔ اردو زبان کے حوالے سے

جہاں انھوں نے شمالی یورپ کے ذرائع ابلاغ پر ایک تجزیاتی و تحقیقی مقالہ لکھا وہیں تعارفی نوعیت کے مضامین بھی انھوں نے یہاں تحریر کیے ہیں۔ جیسے یہاں کے ایک اخبار "ٹوکیو شمبون" میں اردو زبان پر ایک تعارفی مضمون لکھا اور پھر ایک زیادہ اہم مضمون "قومی زبان کی تعلیم" کے عنوان سے 2006 میں لکھا ہے جس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ایک کثیر اللسانی معاشرے (پاکستان) میں قومی زبان کی تعلیم کس حد تک مفید اور مؤثر رہی ہے اور قومی مقاصد کس حد تک اس سے بارآور ثابت ہوتے ہیں۔ ان کا یہ ایک تازہ مقالہ بے حد مبسوط اور وقیع ہے اور یہ ان کی ایک اہم تحقیقی کاوش ہے، جس کے لیے انھوں نے راست انگلستان کے کتب خانوں سے استفادہ کیا اور بالخصوص مستشرقین کی اولین اردو خدمات اور ان کی قواعد اور لغت نویسی کو سامنے رکھ کر اپنے اس مطالعے کو مکمل کیا ہے۔ مذکورہ سیمینار میں جہاں طباعتی ذرائع ابلاغ کے کردار کو موضوع بنایا گیا، پروفیسر اساداایوتا کا جن کو ڈراموں اور فلموں سے خاص دلچسپی ہے۔ اس حوالے سے تفریحی ذرائع ابلاغ یعنی اردو فلموں کے وسیلے سے اس موضوع کے متن کی ایک بہت دلچسپ اور مفید کوشش کی تھی۔ یہ وہی اسادا صاحب ہیں جو قبل ازیں دکنی زبان اور پاکستان کی بلتی زبان پر عمدہ مقالات لکھ چکے ہیں۔ انھوں نے بنیادی بلتی کی فرہنگ بھی بنائی ہے۔

اب یہاں ضروری ہے کہ اوساکا یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے نوجوان استاد پروفیسر مامیا کین ساکو کے کاموں کا حوالہ دیا جائے جو خاص طور پر اپنی ترجیحات اور توجیہات میں زبان اور لسانیات کو نمایاں رکھتے ہیں۔ یہ نہ صرف اردو پر عبور رکھتے ہیں بلکہ سندھی بھی جانتے ہیں اور سندھ یونیورسٹی سے ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب مرحوم کی نگرانی میں "اردو سندھی کے لسانی اشتراک" کے موضوع پر ایم.فل. کر چکے ہیں۔ ان کے ایم.فل. کے اس مقالے کا ایک باب 2003 کے "اخبار اردو" کے خاص شمارہ سندھ میں شائع ہوا تھا اور پھر یہ مقتدرہ کے تازہ مجموعۂ مضامین "پاکستانی ادب" میں سندھ سے متعلق حصے میں بھی شامل ہوا ہے۔ چونکہ ماميا صاحب ایک علاقائی زبان اور اردو کے اشتراک اور لسانی خصوصیات کو موضوع بنا چکے ہیں اس لیے انھوں نے اپنی اس دلچسپی کے پیش نظر اپنے اس نوع کے مطالعے کو جاری رکھا ہوا ہے اور حال میں انھوں نے نہایت اہم کام سرانجام دیے ہیں۔ جیسے انھوں نے ایک مقالہ پاکستان کی علاقائی زبانوں کے باہمی روابط کے حوالے سے لکھا اور ایک ایسی منظر کشی کی ہے کہ جس سے علاقائی زبانوں کے باہمی روابط سے تشکیل پانے والا قومی اتحاد ابھر کر سامنے آتا ہے۔ پھر طباعت کے حوالے سے بھی ان کا ایک مقالہ ہے جس میں اردو زبان کے ایک سلسلۂ عمل (نیٹ ورک) پر انھوں نے غور کیا ہے اور اس کی تشکیل کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان مقالات اور کاوشوں سے قطع نظر ان کا ایک محنت سے لکھا ہوا ایک تحقیقی مقالہ ہے جس میں انھوں نے پاکستان میں ابھرنے والی لسانی تحریکوں کی سنہ وار ایک ایسی مفید تاریخ مرتب کر دی ہے جو اپنی نوعیت کی شاید واحد ایسی کوشش ہے کہ جس کی مدد سے ہم سیاسی اور قومی سطح پر ابھرنے والی تحریکوں کو ایک مربوط اور سنہ وار ترتیب کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔ ان کی مرتبہ یہ تاریخ سنہ 1835 سے 2004 تک کی لسانی تحریکوں یا لسانی نشیب و فراز اور ہیجانات کا گوشوارہ پیش کر دیتی ہے۔ ان کی یہ کاوش دراصل گوشوارے کی صورت میں ہے جس کے آغاز میں ایک مختصر تعارف اور آخر میں اپنے مآخذ کی فہرست انھوں نے پیش کی ہے۔

حال میں، جاپان میں اردو زبان و لسانیات کے حوالے سے جو کام ہوئے ہیں، یہاں ان کا ایک بہت سرسری سا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ یہاں روز افزوں جاری ہے اور طلبہ میں بھی یہ رجحان، ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز اور "اوساکا یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز" دونوں جامعات میں فروغ پا رہا ہے جس کا احاطہ کرنا فی الوقت راقم کے لیے ممکن نہیں کیونکہ طلبہ کے مطالعات زیادہ تر ان کے گریجویشن اور ایم.اے. کے مقالات کی صورت میں ہوتے ہیں اور جن کا زیادہ انحصار دراصل ثقافتی اور لسانی عنوانات پر ہوتا ہے اور چونکہ ان کا کوئی باقاعدہ اندراج نہیں کیا جاتا اس لیے ان کا احاطہ کرنا آسان نہیں۔ بہرحال یہاں لسانی مطالعات کا وہ تسلسل، جس کا آغاز اردو کے حوالے سے یہاں شاید اے ایجی اینوے نے "مستشرقین کا مطالعۂ زبان ہند (ہندوستانی)" لکھ کر کیا تھا، کبھی ٹوٹا نہیں، دن بدن اس میں اضافہ ہی ہوا ہے اور آئے دن یہ روز افزوں ہے۔ یہ اینوے شاید ایک سفارت کار تھے اور لندن کے اپنے دوران قیام، وہاں کی دستاویزات اور مآخذ کے ذریعے اس موضوع پر مطالعہ کرتے رہے اور بالآخر انھوں نے اپنا یہ مقالہ Indo Yosho (بحر ہند) نامی تحقیقی مجلّے کے دسویں شمارے میں جو 1933 میں شائع ہوا تھا، لکھا تھا۔ اس مضمون کا مرکزی خیال یہ تھا کہ فارسی آمیز ہندوستانی میں دراصل اردو ہے اور یہ زبان سولھویں صدی کے آخر ہی سے جنوبی ایشیا کی مسلمہ لنگوا فرینکا بنی ہوئی ہے۔ پروفیسر یاما نے اپنے مؤخر الذکر مقالے کی تیاری کے دوران اپنے مآخذ کی جستجو میں بالآخر اینوے صاحب کے اس مقالے تک رسائی حاصل کر لی اور استفادہ بھی کیا۔

جاپان میں اس وقت اردو زبان و ادب کی تدریس اور مطالعہ و تحقیق کے تین مراکز ہیں جو "ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز"، "اوساکا یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز" اور "دائی توبُنکا یونیورسٹی" کے شعبہ ہائے اردو کی صورت میں قابل قدر اور نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں، لیکن تدریس اور تعلیم بعض دوسرے مقامات اور درس گاہوں اور وزارتِ خارجہ کے لینگویج اسکول میں بھی

دی جاتی ہے اور ان یونیورسٹیوں کے علاوہ کئی یونیورسٹیاں ہیں جہاں جنوبی ایشیا، اسلامیات اور عالم اسلام سے متعلق موضوعات پر تحقیق و مطالعہ بھی ایک دیرینہ روایت کا حامل ہے، جس کا ذکر آئندہ کبھی۔

پس نوشت: ابھی یہ سطور ارسال کی جا رہی تھیں کہ کیوتو یونیورسٹی کے معروف تحقیقی مجلے "Bulletin of the Society for Western and Southern Asiatic Studies" کا تازہ شمارہ ستمبر 2007 موصول ہوا۔ اس میں پروفیسر سویامانے، کا ایک تازہ تر، بسیط اور نہایت محققانہ مقالہ شامل ہے جس کے عنوان کا اردو ترجمہ یوں ہوگا: ''انیسویں صدی کے آغاز میں اردو املا (کے مسائل)''۔ دراصل یہ مقالہ اس وقت کے ہندوستان میں انگریزوں کی لسانی تحقیقات، لغت اور قواعد نویسی کے ضمن میں ان کی کاوشیں، انگریزوں کی لسانی حکمت عملی اور اردو زبان و ادب کے لیے ان کی خدمات پر مشتمل ہے لیکن بالخصوص اس وقت اردو املا، رسم الخط کے جو مسائل درپیش تھے اور ان کے تعلق سے انگریزوں نے جو کچھ کہا یہ مقالہ ان موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ مقالہ نگار نے اس کی تیاری میں جو محنت اور تلاش و جستجو کا ثبوت دیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ اس عہد کے بنیادی مآخذ اور کتب حوالہ، یہاں تک کہ انگلستان کے ذخائر میں جو متعلقہ دستاویزات سے انھوں نے، استفادہ کیا، ان سب کا اندراج ان کے حواشی اور کتابیات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ کاش یامانے صاحب اس کو انگریزی یا اردو میں بھی منتقل کر دیں تا کہ اس سے استفادے کا حلقہ وسیع ہو جائے۔

□□□

(بشکریہ ماہنامہ ''اخبار اردو'' اسلام آباد)

جدید
ہندی — اردو لغت (دو جلدوں میں)

(ہندی الفاظ کے معنی اردو اور دیوناگری رسم الخط میں)

مرتب: پروفیسر نصیر احمد خاں

(سابق چیئرپرسن، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)

ٹیکنک اور ترتیب و تقسیم کے اعتبار سے'' جدید۔ ہندی اردو لغت'' اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے جس میں قدیم و جدید ہندی کے الفاظ، ان کے تلفظات، مآخذ اور نحوی زمروں کے علاوہ معنی و مفہوم کو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں کی مرتب کردہ یہ لغت ایک مفید، کارآمد اور سنجیدہ تحقیق ہے جو اردو اور ہندی کے طلبہ کی بیشتر ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

صفحات: 3383 (دونوں جلدیں)، قیمت -/1700 روپے (دونوں جلدیں)

اقبال کی کہانی (پانچواں ایڈیشن)

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال کو عالمی ادب کے منظرنامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعرانہ کمالات کے علاوہ ان میں شگفتہ مزاجی بھی غضب کی تھی۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں میں بڑے باریک نکتے اور بذلہ سنجی پائی جاتی ہے۔ اقبال کو اپنے ملک و قوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ رہا تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے بہت سی خوب صورت نظمیں لکھیں۔ ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کا جامع تعارف اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت -/13 روپے

عارف وقار

مذکر مؤنث کی کج ادائیاں

عام زندگی میں ہم نر اور مادہ کی جو تقسیم دیکھتے ہیں وہ محض جانداروں تک محدود ہے یعنی ہمیں معلوم ہے کہ بکری مادہ جبکہ شیر نر ہے۔ البتہ اگر نر اور مادہ کی اس تقسیم کو بے جان چیزوں پر لاگو کر دیا جائے تو کیسے پتا چلے گا کہ ''پلنگ'' مذکر ہے یا مؤنث اور ''میز'' (ٹیبل) ہوتی ہے یا ہوتا ہے۔

آج کی نشست میں ہم اسی مخمصے پر کچھ بات کرنا چاہتے ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ آیا واحد اور جمع کی طرح مذکر اور مونث کے تعین کے لیے بھی ہماری زبان میں کوئی واضح اصول موجود ہیں۔ سب سے پہلے تو اس بات کو سمجھ لینا چاہیے کہ جنسِ حقیقی کا وجود صرف جانداروں ہی میں ہوتا ہے اور جانداروں کی تذکیر و تانیث کے لیے اصول وضع کیے جاسکتے ہیں لیکن جن زبانوں میں بے جان اشیا کی بھی جنس ہوتی ہے (یعنی میز، کرسی، کمرہ، فرش وغیرہ بھی جنس یا جینڈر رکھتے ہیں) ان میں تذکیر و تانیث کے اصول وضع کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے اور ہمیں اہلِ زبان کی پیروی کرنی پڑتی ہے یعنی جن بے جان چیزوں کو وہ مؤنث بولیں ہم بھی اسے مونث ہی سمجھ لیں اور جس کو وہ مذکر استعمال کریں ہم بھی اسے مذکر ہی قرار دیں۔

کچھ اہلِ زبان اس سلسلے میں چند اصولوں کا ذکر بھی کرتے ہیں اور قواعد نویسوں نے بھی بے جان چیزوں کی تذکیر و تانیث کے کچھ قاعدے قانون اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مضمون میں ہم ان کوششوں کا ذکر بھی کریں گے۔

تو آیئے آغاز اپنے روزمرہ تجربے سے کرتے ہیں جس کے تحت ہمیں معلوم ہے کہ لڑکا مذکر ہے اور لڑکی مؤنث ہے۔

تین چار سال کی عمر میں ہمیں یہ اصول تو معلوم نہیں تھا کہ الف پر ختم ہونے والے مذکر اسا کو مؤنث بنانا ہو تو ان کی آخری الف کو چھوٹی 'ی' میں بدل دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود خود ہم مرغا، مرغی، بکرا، بکری، گدھا، گدھی یا گھوڑا، گھوڑی کے سلسلے میں کوئی غلطی نہیں کرتے تھے۔

البتہ جب چڑا، چڑی، کتا، کتی تک بات پہنچی تو کسی بزرگ کا غضبناک چہرہ دیکھنا پڑتا اور تذکیر و تانیث کے وہ معصوم سے اصول جو ہم نے لاشعوری طور پر اپنا رکھے تھے، دھواں بن کر اُڑ جاتے۔ اس بات کا منطقی جواب کوئی نہیں دیتا تھا کہ چڑی کو چڑیا اور کتی کو کتیا کیوں ضروری ہے۔

اسکول میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ تذکیر و تانیث کی دنیا تو پوری اندھیر نگری ہے اور وہاں نر مادہ کے اصولوں کی کھلی خلاف ورزیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً کوا، ہدہد، خرگوش، لنگور، گدھ، کچھوا، مچھر اور جھینگر کے بارے میں پتہ چلا کہ ان بے چاروں کی مؤنث شکل موجود ہی نہیں ہے۔ دل میں بار بار خیال آتا کہ مسٹر خرگوش کے گھر میں کوئی مسز خرگوش بھی تو ہوگی، لنگور کی بیوی، گدھ کی ماں کچھوے کی بہن، کیا یہ سب ہستیاں وجود ہی نہیں رکھتیں؟ اور اگر ہیں تو ان کے لیے الفاظ کیوں موجود نہیں۔ اس بے انصافی اور زیادتی پر ایک بار بہت گڑگڑا کر اپنے استاد سے سوال کیا تو وہ بھنا کر بولے'' بے انصافی تو دونوں طرف سے ہے..... مچھلی کے شوہر کا نام سنا ہے کبھی؟ وہ بھی تو وجود رکھتا ہے۔

ہمیں لاجواب پا کر استاد جی نے پوری فہرست گنوادی، فاختہ، مینا، چیل، مرغابی، ابابیل، مکھی، چھپکلی، چھچھوندر..... کیا ان سب کے باپ بھائی وجود نہیں رکھتے؟ لیکن ان کے لیے کوئی علاحدہ الفاظ موجود نہیں ہیں۔

چند برس بعد استاد جی سے ملاقات ہوئی تو ان کی بھناہٹ بدستور قائم تھی، دیکھتے ہی بولے، اب بڑے ہوگئے ہو، اس فہرست میں ڈائن، چڑیل، کسبی، رنڈی، سوکن اور سہاگن بھی شامل کرلو کیونکہ ان کا بھی کوئی مذکر نہیں ہے۔''

اس سرزنش کے بعد ہم نے استاد جی سے تو پوچھنا چھوڑ دیا لیکن اپنے طور پر تذکیر و تانیث کی کوئی منطق تلاش کرتے رہے۔ جاندار اشیا کے لیے جب کچھ اصول مل گئے تو انھیں بے جان اشیا پر آزما کے دیکھا اور ابتدائی نتائج انتہائی حوصلہ افزا تھے۔

ذہن میں یہ سوال تھا کہ عربی سے ایک لفظ'' قلم'' اردو میں آتا ہے اور مذکر قرار دیا جاتا ہے لیکن لکھنے کے لیے استعمال ہونے والی دوسری چیز ''پنسل'' انگریزی سے اردو میں آتی ہے اور مؤنث ہوجاتی ہے۔

اس وقت تک کے مطالعے سے یہ اصول تو ذہن میں پختہ ہو چکا تھا کہ بے جان چیزوں کی تذکیر و تانیث کے پیچھے بھی جانداروں کی تذکیر و تانیث ہی کام کر رہی ہوتی ہے۔ مثلاً چھوٹی 'ی' پر ختم ہونے والے اسا لڑکی، مرغی اور بکری کی جنس حقیقتاً مؤنث ہے چنانچہ اردو میں اسی قیاس پر گاڑی، پالکی، ڈولی، کشتی وغیرہ کی جنس بھی مؤنث بن گئی۔ اب چونکہ یہ سب سواری کے لیے استعمال ہونے والی اشیا ہیں چنانچہ ان کے مزید قیاس پر دیگر سواریوں کو بھی مؤنث سمجھ لیا گیا اور ٹرین، ریل، ٹرام، فٹن، بگھی، موٹر، بس، رتھ اور ناؤ وغیرہ سب مؤنث

قرار پا گئیں لیکن کاش ہم اسے ایک اصول قرار دے سکتے کیونکہ ابھی آپ اس ''دریافت'' پر مسکرا ہی رہے ہوں گے کہ آپ کو جہاز کا خیال آ جائے گا۔

کشتی یا ناؤ سائز میں کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو وہ مؤنث ہی رہے گی۔ حتیٰ کہ کشتیِ نوح بھی مؤنث ہے لیکن جہاز خواہ کشتی سے بھی چھوٹا ہو وہ مذکر کہلائے گا حالانکہ وہ بھی سواری کی چیز ہے۔

موٹر کو بھی ہم تو مؤنث ہی گردانتے ہیں لیکن علامہ اقبال نے اسے مذکر باندھا ہے:

''موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش!''

اور پھر تانگہ، ریڑھا، ٹھیلا وغیرہ بھی استعمال کے لحاظ سے تو سواری یا بار برداری کے زمرے میں آتے ہیں لیکن مؤنث نہیں ہیں۔ گویا بزعم خود ہم نے بے جان چیزوں کی تذکیر و تانیث کے اصولوں کا جو محل تعمیر کیا تھا وہ دھڑام سے نیچے آ رہا ہے۔

عربی میں ارض (زمین)، دار (گھر)، ریح (ہوا)، شمس (سورج)، عقرب (بچھو)، افعی (سانپ)، فردوس (جنت) اور نعل (جوتا) یہ تمام اسما مؤنث ہیں کیونکہ اہلِ زبان نے اسی طرح قرار دیا ہے۔

لیکن اردو میں زمین، ہوا اور جنت تو عربی کی طرح مؤنث ہیں جبکہ سورج، جوتا، سانپ اور بچھو مذکر ہیں اور لاکھ کوشش کے باوجود بھی ہم اس کا کوئی منطقی یا حسابی کلیہ پیش نہیں کر سکتے۔

جو تھوڑی بہت منطق تلاش بھی کی جاتی ہے وہ بھی بہت جلد بھک سے اُڑ جاتی ہے۔ مثلاً عربی میں ریح (ہوا) کے متعلق یہ اصول دریافت کیا گیا کہ اس کے مؤنث ہونے کے باعث ہر طرح کی ہوا کا نام عربی میں مؤنث ہے۔ اس اصول کو اردو پر لاگو کرتے ہوئے بعض قواعد نویسوں نے لکھا ہے کہ لفظ ہوا کے مونث ہونے کے باعث نسیم، صبا، پروا، پچھوا، لو اور آندھی سب مؤنث ہیں۔ لیکن ابھی اس اصول کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوتی کہ زور کا ایک بگولہ اٹھتا ہے اور آپ کے اصول کو پرِ کاہ کی طرح اڑا لے جاتا ہے، آخر بگولہ اور جھکڑ بھی تو ہوا کی قسمیں ہیں، پھر یہ کیوں مؤنث نہیں ہیں؟

بھاری بھرکم اور بڑے سائز کی چیزوں کو اردو میں عام طور پر مذکر کے کھاتے میں ڈالا جاتا ہے جبکہ چھوٹی، نرم و نازک اور نفیس چیزیں عموماً مؤنث گردانی جاتی ہیں، مثلاً موٹا اور مضبوط ہو تو رسا (مذکر) اور پتلی اور نسبتاً کمزور ہو تو رسی (مؤنث) اسی طرح بڑا اور وزنی ہو تو گولا (مذکر) لیکن چھوٹی اور ہلکی پھلکی ہو تو گولی (مؤنث)۔ یہی صورتِ حال پگڑ اور پگڑی، ٹوپ اور ٹوپی، گھڑیال اور گھڑی میں بھی دیکھی جا سکتی ہے لیکن یہ کوئی مستند اصول نہیں ہے کیونکہ اس کے بالکل برعکس کوٹھا محض ایک کمرے کا تاثر دیتا ہے جبکہ کوٹھی ایک وسیع و عریض عمارت ہوتی ہے جس میں بہت سے کمرے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ''توا'' ایک چھوٹے سائز کی چیز ہے جس پر ایک وقت میں صرف ایک روٹی پکتی ہے لیکن ''توی'' ایک بہت بڑا توا ہوتا ہے جس پر لنگر کے لیے بہت سی روٹیاں بیک وقت پکائی جا سکتی ہیں۔

پھر یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ ''موتی'' چھوٹی ''ی'' پر ختم ہونے کے باوجود ایک مذکر لفظ ہے اور بہت بڑے موتی کے لیے ہمارے پاس ''موتا'' جیسا کوئی لفظ نہیں ہے۔

عربی کے وہ سہ حرفی الفاظ جن کے آخر میں الف ہو ہمارے یہاں مؤنث بولے جائیں گے مثلاً دعا، ادا، بقا، فنا، بلا، وفا، قضا، صدا، دوا، قبا، سزا جزا یہ سب مؤنث ہیں لیکن عصا، طلا اور زنا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ بھی تو عربی کے سہ حرفی الفاظ ہیں اور الف پر ختم ہو رہے ہیں لیکن ہمیشہ مذکر بولے جاتے ہیں۔

ہندی سے آنے والے الفاظ جن کے آخر میں چھوٹی ''ی'' ہوتی ہے انھیں ہمارے یہاں بطور مؤنث قبول کیا جاتا ہے مثلاً روٹی، بوٹی، نالی، جالی، گالی، تھالی، چکی، ڈولی، مولی، سولی، کٹوری، موری وغیرہ لیکن پانی، دہی، گھی، جی (دل) اور ہاتھی وغیرہ چھوٹی ''ی'' پر ختم ہونے کے باوجود مذکر ہیں۔

تمام صحائف آسمانی مؤنث ہیں مثلاً انجیل، توریت، زبور وغیرہ۔ ہندوؤں کی مقدس کتابیں گیتا اور رامائن بھی مؤنث ہیں لیکن قرآن مذکر ہے۔

نشے کے سارے مسالے مؤنث ہیں یعنی بھنگ، افیون، چرس، کوکین، ہیروئن وغیرہ لیکن گانجا بد بخت الگ ہی کھڑا مسکرا رہا ہے۔ شراب مؤنث ہے اور اس کی تمام قسمیں بھی مثلاً وہسکی، جن، واڈکا، شیمپین، شیری، مارٹینی، بیئر لیکن ذرا ادھر دیکھیے ٹھرا الگ ہی اپنا رنگ دکھا رہا ہے۔ سگریٹ اور بیڑی اگر بڑے سائز کی بھی ہو تو مؤنث ہی کہلائے گی لیکن سگار ہر صورت میں مذکر ہے، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، پتلا ہو یا موٹا۔

ستارہ چونکہ مذکر ہے اس لیے اکثر ستاروں کے نام مذکر ہیں لیکن زہرہ، ناہید اور مشتری نے الگ ہی اپنی زنانہ پارٹی بنا رکھی ہے۔ کالا، پیلا، نیلا، مٹیالا وغیرہ سب رنگ بنیادی طور پر تو مذکر ہیں لیکن چونکہ صفت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اس لیے مذکر اسم کے ساتھ مذکر اور مؤنث اسم کے ساتھ مؤنث ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کالا گولا، نیلی چھتری، ہرا پان، پیلی پتی، مٹیالا بادل، روپہلی دھوپ وغیرہ۔

سال یا سن اردو میں ہمیشہ مذکر استعمال ہوتا ہے مثلاً 1965 ان کی زندگی

میں بڑا اہم تھا۔ تمام اسلامی، دیسی اور انگریزی مہینوں کے نام مذکر ہوتے ہیں جیسے نومبر گزر گیا، محرم آنے والا ہے لیکن کچھ لوگ جنوری، فروری، مئی اور جولائی کو (آخر میں چھوٹی ''ی'' ہونے کی وجہ سے) مؤنث کے طور پر لیتے ہیں مثلاً جنوری گزر گئی فروری آ گئی۔

وقت کی تقسیم کے لیے مقرر تمام اکائیاں مذکر ہیں یعنی گھنٹہ، منٹ، سیکنڈ، لمحہ، لحظہ، دقیقہ وغیرہ سب مذکر ہیں لیکن یہ اصول بھی گھڑی دو گھڑی کا مہمان ہے کیونکہ گھڑی (بمعنی لمحہ) لیکن بے چاری جمعرات تانیث کی چنری اوڑھے ایک کونے میں الگ کھڑی ہے۔

قیمتی پتھروں اور دھاتوں کے بارے میں تو ایک اٹل کلیہ بنا ہی چاہتا تھا کیونکہ سونا، لوہا، تانبا، پیتل، ٹین، جست اور ہیرا، جوہر، لعل، زمرد، یاقوت، نیلم پکھراج وغیرہ سب مذکر ہیں لیکن برا ہو اس چاندی کا جس نے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔

''ت'' پر ختم ہونے والے عربی فارسی کے اسما (جبکہ ''ت'' سے پہلے والے حروف پر زبر ہو) مؤنث بولے جاتے ہیں مثلاً شوکت، حشمت، رحمت، زحمت، حرمت، حیرت، دولت، ثروت، صولت، عصمت، خدمت وغیرہ اور انھی کے نمونے پر ہندی سے آنے والے اسما بھی مؤنث بن گئے مثلاً چلت پھرت، بچت، جگت، چاہت، چپت (تھپڑ) رنگت، سنگت، کہاوت، کھنڈت، کھپت، لاگت وغیرہ سب مؤنث ہیں لیکن ہوشیار خبردار! ''شربت'' مذکر ہے۔

اتنی بے اصولیوں کا ذکر کرنے کے بعد آئیے آخر میں ایک اصول کی بات بھی کرلیں۔ زبان اور بولی مؤنث ہیں اور تمام زبانوں کے نام بھی مؤنث ہیں۔ مثلاً فارسی، عربی، بلوچی، سندھی، یونانی، عبرانی، وغیرہ۔ تاہم ان کے آخر میں جو چھوٹی ''ی'' ہے وہ علامت تانیث نہیں بلکہ علاقے یا قوم کی نسبت کو ظاہر کرتی ہے اور جن زبانوں کے نام چھوٹی ''ی'' پر ختم نہیں ہوتے مثلاً پشتو، سنسکرت، اردو، ہندی، فرنچ، جرمن، ڈچ، وہ سب بھی مؤنث ہی شمار ہوتی ہیں۔ لفظ اردو اپنے قدیم معانی میں (لشکر گاہ، فوجی پڑاؤ، شاہی دربار) مذکر تھا لیکن اب زبان کے مفہوم میں مؤنث ہے۔

اردو میں تذکیر و تانیث کے مسئلے کو گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے دوران شعر و شاعری کے باعث بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ انیسویں صدی کے وسط سے بیسویں صدی کے آغاز تک مذکر مؤنث کے جھگڑے پاسینکڑوں رسالے کتابچے اور مقالے لکھے گئے۔ ان مضمون نگاروں کا بنیادی مقصد غزل میں الفاظ کی درست تذکیر و تانیث کو یقینی بنانا تھا۔ دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے ماہرین عروض میں اس موضوع پر ساٹھ ستر برس تک گرما گرم بحثیں جاری رہیں اور مذکر مؤنث کے مسئلے پر شعرا میں کئی ذیلی مکاتب فکر بھی پیدا ہو گئے

چونکہ غیر جاندار چیزوں کی جنس کوئی فطری امر نہیں ہے بلکہ ہماری خودساختہ چیز ہے اس لیے حتمی طور پر یہ مسئلہ ابھی حل نہیں ہو سکا اور شاید اسے حل ہونا بھی نہیں چاہیے کیونکہ ہر زندہ، زبان اپنے بولنے والوں کی لسانی اداؤں کے تابع ہوتی ہے اور اردو یقیناً ایک زندہ و تابندہ زبان ہے۔

□□□

(بشکریہ ماہنامہ ''اخبار اردو'' اسلام آباد)

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں ''پس نوشت: آج یہ کتاب'' کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ڈیمائی سائز، صفحات: 528، قیمت-/228 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

ندا فاضلی

باقر مہدی — ایک نئے انداز کا فن کار

باقر مہدی کی رحلت نے مجھ سے ایک ایسی شخصیت چھینی ہے جو بیک وقت میری ضرورت بھی تھی اور جس سے مجھے محبت بھی تھی۔ ضرورت یوں کہ ادبی لحاظ سے خالی ہوتی ممبئی میں وہ اکیلے رہ گئے تھے جو کسی لفظ کے تلفظ، کسی محاورے کے درست استعمال، کسی انگریزی، فارسی یا اردو کتاب کے نام یا اس کے کسی حوالے سے یا تو فوری جواب دیتے تھے یا کچھ وقت لے کر چھان بین کرتے اور زبانی یا فون پر سوال کو جواب میں ڈھال دیتے تھے اور محبت اس لیے تھی کہ وہ شوروغل کے اس شہر میں اکیلے ایسے تھے جن سے سیاست، ادب فلسفہ، نفسیات اور تاریخ پر مکالمہ ممکن تھا۔ وہ جب بامبکلہ میں لیڈر پریس کے احاطے کے ایک کونے کے ایک چھوٹے سے کمرے میں تھے اس وقت بھی ان کی ضرورتوں کی اشیا کے مقابلے میں کتابوں کی تعداد زیادہ تھی اور جب وہ وہاں سے روی درشن کی پانچویں منزل کے ایک فلیٹ میں منتقل ہوئے ان دنوں بھی ان کا گھر، گھر سے زیادہ کتابوں کی دکان لگتا تھا۔ ایک بار میں پونا میں رجنیش کے آشرم میں گیا تھا۔ وہاں ان کی لائبریری دیکھ کر میں حیران ہوگیا تھا۔ اس میں تقریباً پچاس ہزار سے زیادہ کتابوں کا ذخیرہ نہایت سلیقے سے لکڑی کے شیلفوں میں سجا تھا۔ ان کتابوں کو دیکھ کر مجھے شک ہوا۔ میں نے سوچا ایک آدمی، ایک زندگی میں ان ساری کتابوں کو کیسے پڑھ سکتا ہے اور وہ بھی مختلف موضوعات اور زبانوں کی کتابیں! اپنے شک کو پختہ کرنے کے لیے میں نے یوں ہی ایک شیلف سے ایک کتاب نکالی، اسے کھول کر دیکھا تو اس میں کئی جگہ رجنیش کے ہاتھ سے لکھے ہوئے نوٹ نظر آئے۔ میں نے اسے محض ایک اتفاق سمجھا اور پھر گھومتے ہوئے کسی اور الماری سے کوئی اور کتاب نکال کر دیکھی۔ اس میں بھی کئی سطریں خط کشیدہ نظر آئیں۔ باقر صاحب بھی گفتگو یا تقریر میں مصنفوں کے نام اور کتابوں کے حوالے دہراتے تھے۔ وہ تیز تیز بولتے تھے اور بولتے ہوئے ہمیشہ عجلت میں نظر آتے تھے۔ تھوڑے سے وقت میں زیادہ سے زیادہ نام لینا اور کئی کئی کتابوں کے حوالے دینا ان کا مزاج تھا۔ پڑھنے کا مجھے بھی شوق ہے لیکن میں عام آدمی کی طرح روٹی روزی کے لیے کام بھی کرتا ہوں، روٹی بھی کھاتا ہوں، کپڑے بھی پہنتا ہوں، دوستوں کے ساتھ شام کی خوش گپیاں بھی کرتا ہوں اور اس کے ساتھ کتابیں بھی پڑھتا ہوں۔ باقر صاحب کے یہاں کتابوں کا انبار دیکھ کر مجھے کئی فلمی اداکار یاد آتے تھے جن کی کشادہ رہائش گاہوں میں ایک پورا کمرہ لائبریری کے لیے بھی مخصوص ہوتا تھا لیکن اس کمرے میں سوائے خاموشی کے ہر داخلہ ممنوع تھا۔ باقر صاحب کے بارے میں پہلے میری بھی ایسی ہی رائے تھے۔ پھر ایک دن اچانک صبح کے وقت کیفی اعظمی صاحب کا فون آیا۔ انھیں اپنی دوسری شعری کتاب "آخرِ شب" کی ضرورت تھی۔ اتفاق سے وہ میرے پاس نہیں تھی۔ میں نے باقر صاحب کو فون کیا۔ ان کے گھر میں وہ کتاب تھی بھی اور وہ اسے ہمیشہ کے لیے دینے کو بھی تیار تھے۔ انھوں نے کہا "میری لائبریری میں وہ کتاب ہے لیکن ایک ہی شرط پر دے سکتا ہوں کہ اسے پھر واپس نہیں لوں گا۔" وہ میرے جدوجہد کے دن تھے۔ کہیں کھانا کہیں شراب۔ کیفی صاحب کے جوہو کے بنگلے میں آج شام کو اس کتاب کے بہانے، دونوں کے ایک ساتھ ملنے کی امید تھی۔ میں کتاب لے کر جو گیا۔ اچھے اچھے کھانوں اور شرابوں سے سجی ایک بڑی سی میز بنگلے کے ہرے بھرے باغ میں میرا انتظار کررہی تھی۔ کتاب کو میرے ہاتھ سے شوکت کیفی (ان کی بیگم) نے لے لیا اور ورق گردانی کرنے لگیں۔ اس کتاب کا انتساب انھی کے نام کے پہلے حرف 'ش' سے منسوب تھا۔ شادی سے پہلے، اس کتاب کے انتساب میں کیفی کے لفظ تھے:

'ش' کے نام، میں تنہا اپنے فن کو آخرِ شب تک لا چکا ہوں تم آجاؤ تو سحر ہوجائے.....!

شوکت جواب ان کی اہلیہ بن چکی تھیں اور ان کے دو سیانے بچوں (شبانہ اور بابا اعظمی) کی ماں بننے کا شرف حاصل کرچکی تھیں، کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے چہرے سے، آنکھوں سے، ماتھے پر پڑتی شکنوں سے اور دانتوں کو ہونٹوں سے کاٹتے ہوئے کچھ ایسا تاثر دے رہی تھیں جیسے انھیں کتاب پاکر خوشی نہیں ہوئی۔ ناراضگی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور پھر اچانک اپنی خوبصورت آواز کو بدصورت چیخ میں بدلتے ہوئے ان کے ہونٹوں سے لفظ نکل رہے تھے: "لے جاؤ اسے نہیں چاہیے یہ ہمیں۔ بدتمیز، بے غیرت، بے وقوف۔" ان تینوں القاب کے ساتھ وہ کتاب مجھے لوٹا رہی تھیں اور کیفی انھیں ایسا کرنے سے منع کررہے تھے۔ آخر جیت شوکت صاحبہ کی ہوئی اور میں کتاب کو لے کر بجی سجائی کھانے اور شراب کی میز چھوڑ کر واپس چلا آیا۔ باقر مہدی کی کتاب بینی کی عادت نے اس رات مجھے بھوکا سلایا تھا۔ بس میں کتاب کو کھول کے دیکھا تو اس میں باقر صاحب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کئی جملے دکھائی دیے۔ ان تنقیدی جملوں سے معلوم ہوا شوکت صاحبہ کے دیے ہوئے القاب

میرے لیے نہیں باقر صاحب کے لیے تھے۔ حسن نعیم کے نام باقر نے ایک غزل کہی تھی جو ان کی کلیات ''سیاہ سیاہ'' میں صفحہ 300 پر ہے، اس میں دو شعر یوں ہیں:

کیا خبر تھی سرکشی کے حرف تک مٹ جائیں گے
جرأتیں چھن جائیں گی، مجبوریاں رہ جائیں گی
اشتہاری زندگی فن کار کو کھا جائے گی
شہرتوں کے شوق میں رسوائیاں رہ جائیں گی

دوسرے شعر میں دونوں مصرعوں میں 'گی' کی تکرار غزل کی رائج قواعد سے باقر صاحب کے انحراف اور بغاوت کا ثبوت ہے۔ وہ نہ سماج کی مستعمل اقدار کو مانتے تھے نہ اردو شاعری کے کلاسیکی معیار کو گردانتے تھے۔ وہ معاشرتی پابندیوں کے دائرے میں اپنی آزادیوں پر اصرار کرتے تھے۔ 'اپنے ہم عصروں کے نام' ان کی ایک غزل ہے۔ سمجھانا چاہیے، لڑ جانا چاہیے، اس میں پہلے ایک شعر تھا جو'' سیاہ سیاہ'' میں شامل (صفحہ 93) نہیں کیا گیا وہ یوں تھا:

بحروں کو توڑ تاڑ کے نالے میں ڈال دو
بس دل کی لے میں فکر کو ڈھل جانا چاہیے

باقر صاحب 'دل کی لے' کے قائل تھے۔ ان کے اظہار و معیار کے پیمانے خودساختہ تھے۔ ان کی شاعری اور نثر کی فکری ترجیحات اور اظہار و بیان کے معیارات اپنے تھے۔ ان کا شعری سفر جو ''شہر آرزو'' اشاعت 1958 سے شروع ہوا اور اس کے بعد'' کالے کاغذ کی نظمیں'' (1967) ''ٹوٹے شیشے کی آخری نظمیں'' (1972) ''سیاہ/سیاہ'' (1993) سے گزرتا ہوا، ان کے انتقال کے آخری مہینوں تک بدستور جاری رہا اس میں ہیئت، لفظیات، موضوعات اور ساخت میں بتدریج تبدیلیوں کا احساس ہوتا ہے۔ ان مسلسل تبدیلیوں میں ان کی نجی زندگی کے حادثات و واقعات کے ساتھ بیک وقت کئی زبانوں کے شعری و تنقیدی ادب کے مطالعات کا عمل دخل بھی رہا ہے۔ ابتدا میں خصوصاً ''شہر آرزو'' کی نظموں اور غزلوں پر اس دور کے جوش، اختر شیرانی، یگانہ اور ماضی کے غالب و آتش کے ہلکے گہرے اثرات لفظوں کے انتخاب اور نظموں کی اشکال اور غزلوں میں ہجر و وصال کے طلوع و زوال میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس وقت تک وہ اپنے دیگر ہم عصروں مصطفےٰ زیدی، خلیل الرحمٰن اعظمی، شہاب جعفری وغیرہ کی طرح ترقی پسند تھے اور ان کی ترقی پسندی اس وقت تک اس ترقی پسندی سے مختلف نہیں تھی جس سے بعد میں وہ کافی برگشتہ نظر آتے ہیں۔ وہ اس دور میں بھی ترقی پسند شاعروں کے اس حلقے سے زیادہ قریب تھے جو جذبی، مخدوم، مجاز، جاں نثار وغیرہ پر مشتمل تھا۔ وہ سردار، کیفی اور نیاز حیدر کی طرح کبھی بلند آہنگ یا وضاحتی یا صحافتی نہیں ہوئے۔ اس مجموعے میں زیادہ تر تخلیقات ردولی، علی گڑھ اور لکھنؤ وغیرہ کی ہیں۔ اس میں ایسے شعر یا مصرعے ملتے ہیں:

تمھاری آنکھوں میں شاعر کے خواب ہیں کتنے
بہار نو کی مچلتی ہوئی جوانی ہے
تمھاری آنکھوں کی شفاف چاندنی میں نہاں
نئے ستاروں کی خاموش زندگانی ہے
(تمھاری آنکھیں)

جانے کیسے آئے گی انقلاب کی دنیا/شہر یہ امیدوں کا اب بھی جگمگاتا ہے/کون آنے والا ہے/کون آنے والا ہے (شہر آرزو)

ابھی طوفانِ ظلم و جور کی آمد ہی آمد ہے
خلوصِ عشق کی، شوقِ جواں کی آزمائش ہے

شہر آرزو کے بعد کے سارے مجموعے ممبئی میں تخلیق بھی ہوئے اور شائع بھی ہوئے۔ ''شہر آرزو'' اور'' کالے کاغذ کی نظمیں'' کے درمیان تقریباً نو سال کا فاصلہ ہے۔ '' کالے کاغذ کی نظمیں'' سے'' سیاہ/سیاہ'' تک کا تخلیقی سفر باقر کا جانے پہچانے شہر میں ایک اجنبی کا سا سفر رہا ہے۔ یہ سارا سفر انھوں نے اپنے ڈھب سے طے کیا۔ اس میں کبھی نہ ختم ہونے والی بے روزگاری اور اس کے ردِ عمل میں برسر روزگار ادیبوں اور شاعروں سے کدورت بھی ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے کچھ نہ کر پانے کی خجالت اور اس کے ردِ عمل میں تحریر و تقریر کی بغاوت بھی ہے، خاطر خواہ پذیرائی کے فقدان اور اس کے ردِ عمل میں شہرت یافتاؤں سے نفرت بھی ہے۔ مسلسل جدو جہد کی رائیگانی اور اس کے ردِ عمل میں افلاس زدہ بدحالیوں سے رغبت و انسیت بھی ہے۔ باقر مہدی نے ان تمام محرومیوں کا ازالہ کتابوں میں تلاش کیا۔ ان کے اس گہرے مطالعے کے شوق نے ان کی خارجی و باطنی محرومیوں کا ازالہ کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن اس کی وجہ سے ان کی شعری ذہانت اور تنقیدی بصیرت میں وہ تازہ کاری اور انفرادی سرشاری محسوس ہوتی ہے جو ان کے ہم عصروں میں اور بعد کے لوگوں میں کم کم ہی نظر آتی ہے۔ باقر مہدی کی تجربہ کاری اور دل کی لے کاری سے گزرتے ہوئے امریکہ کے انگریزی شاعر والٹ وہٹ مین یاد آجاتے ہیں، جن کی غیر رسمی شاعری کا جب پہلا مجموعہ منظر عام پر آیا تو لوگوں کی متفقہ روایت پسندی نے ان کی جدت کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اردو میں نظیرا کبرآبادی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سلوک ہوا۔ ناقدین کی ساعتی عادتیں آسانی سے نہیں بدلتیں۔ متوسط معاشرے کی اخلاقی و اقداری احاطہ بندی، ادب کی تفہیم اور اس کے کردار کے کشادہ ہونے میں عموماً مانع رہی ہے۔ باقر مہدی کا تعلق جاگیردارانہ معاشرے سے تھا۔ ان کے والد رزم ردولوی مشہور مرثیہ گو تھے۔ لیکن باقر نے شعوری سطح پر

اس نظام کی کھنکی کو جانچ پرکھ کر اپنے آپ کو ڈی کلاس ہی نہیں کیا، ادب کے واسطے سے اس تبدیلی کا احساس بھی دلایا۔ ان کی نظموں میں بار بار سرکش، سرکشی، باغی، بغاوت، کالے کاغذ اور ٹوٹے شیشے اور سیاہ/سیاہ کے استعارے اور رمزیاتی اشارے ان کے مزاج وعمل کی اس نہج کا ثبوت ہیں۔ ساحرلدھیانوی کا شعری رویہ بھی موضوعی لحاظ سے باقر سے مماثلت رکھتا ہے لیکن ساحر کی شاعری پاپولر کلچر اور مشاعراتی انداز کا اکہرا پن لیے ہوئے تھی۔ باقر مزاجاً ادب کے ان دونوں دائروں سے دور ہوکر لفظوں کو اپنی تنہاروی کا اظہار یہ بناتے ہیں جو طبقاتی پسند و ناپسند کے رائج پیمانوں کی نفی ہی نہیں کرتے اسے جانچنے پرکھنے کے لیے مقابلتاً زیادہ آزاد ذہن کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔ باقر کی شاعری کا دائرہ زیادہ کشادہ، زیادہ معاشرتی اور زیادہ زمینی ہے۔ شہرآرزو کی چند نظموں اور غزلوں کو چھوڑ کر اگر ان کے کلام کو دیکھا جائے تو ان کے ہاں نہ تصوف کی قلابازیاں ہیں جو غزل کے خمیر میں شامل ہے، نہ وہ عشقیہ انداز ہے جو قارئین و سامعین کو وقتی فرار سے آسودہ کرتا ہے، نہ وہ صحافتی وضاحت ہے جو نفرت ومحبت کی درجہ بندی کرتی ہے۔ ان کا شعری کردار ٹوٹ پھوٹ کی دنیا میں سرکشانہ سالمیت کا معیار ہے۔ یہ کردار دیسی ہوتے ہوئے بدیسی اور بدیسی ہوتے ہوئے دیسی نظر آتا ہے۔ اس کی دنیا کافی وسیع اور کشادہ ہے۔ اس میں چے گوارا جیسی شہادت بھی ہے، یگانہ جیسی بغاوت بھی ہے، عزیز جاوید جیسی غربت بھی ہے، فرقہ وارانہ سیاست بھی ہے، مذہب بیزاری بھی ہے، حسین ابن علی سے عقیدت بھی ہے، کافکا کے انسان کی کایا پلٹ ہونے کی حکایت بھی ہے، سیموئل بیکٹ کی بے معنویت کی حکایت بھی ہے، وکٹر یوگوف کی لوک روایت بھی ہے، ریز ماریہ رلکے کی دردمندانہ شکایت بھی ہے اور ان سب کے ساتھ لہو کی حرارت بھی ہے اور ناپسند معاشرے میں زندہ رہنے کی یکسانیت بھی ہے۔ باقر مہدی نے مزاج مخالف سماج میں لفظوں کے رواج کو احتجاج کے قریب کرنے کا تجربہ کیا ہے جس کی قبولیت آسان نہیں ہے۔ اس قبولیت کے لیے اجتماعی نظر میں انفرادی جہت کی ضرورت ہے اور جو ادب میں کہیں کہیں اور کبھی کبھی ہی دکھائی دیتی ہے۔

باقر مہدی سب کے ساتھ ایک سے نہیں تھے۔ وہ کسی سے زیادہ قریب تھے، کسی سے کم قریب تھے اور کسی سے قریب ہوکر بھی دور تھے۔ وہ ایک بے چین مزاج کے آدمی تھے۔ وہ لمحہ لمحہ بدلتی دنیا میں خود بھی بدلتے رہے اور اردگرد کے مناظر سے ان کے رشتے بھی ایک مسلسل گردش کے اسیر رہے۔ ادیبوں اور شاعروں سے بھری ممبئی میں ان کے مراسم صرف چند حضرات سے تھے، ان میں اخترالایمان، راجندر سنگھ بیدی اور شیام لال اہم تھے۔ اخترالایمان سے بعد میں اتنے قریب نہیں رہے۔ اس دوری کی وجہ باقر مہدی کے خیال میں ان کی وہ فلمی کامیابی تھی جس نے انھیں کتابوں سے دور کردیا تھا۔ ان میں ذہانت کی وہ شعلگی بجھ گئی تھی جو باہمی دوستی کو روشن رکھنے کے لیے لازمی تھی۔ اخترالایمان نے درمیان میں پیدا ہوئے ان فاصلوں پر ایک نظم بھی لکھی تھی۔ اس میں علامتی انداز میں انھوں نے درپردہ باقر مہدی کے مطالعے کے شوق پر طنز کیا تھا۔ اس نظم کی آخری لائن یوں ہیں:

یہ میں نے مان لیا علم ہے بڑی دولت
اگر کفن نہ بنے یہ تو کیا برائی ہے

راجندر سنگھ بیدی، شیام لال اور اپنی اہلیہ سے وہ آخر دم تک ہم رشتہ رہے۔ ان تین کے علاوہ ان کی زندگی میں اور بھی کئی کرداروں کی اہمیت ہے لیکن یہ سب فلم کے منظرنامے میں چھوٹے موٹے رول ادا کرکے آتے جاتے رہے۔ طویل سفر کی ہم سفری کی سعادت ان میں کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔ ان کے اختلافات یا ناراضگی کی وجہیں نہایت معمولی ہوتی تھیں اور اچانک شناسائی کی ڈور بیچ میں ٹوٹ کر دوسرے الگ الگ ہوکر ایک دوسرے کے ہاتھ میں رہ جاتے تھے۔ باقر اپنے ہاتھ میں ڈور کے سرے کو ڈسٹ بن میں ڈال کر بھول جاتے تھے اور دوسرے اس تعلق شکنی کو مہینوں کا روگ بنا لیتے تھے۔ باقر مہدی لیٹے ہوں، بیٹھے ہوں، لکھ رہے ہوں یا پڑھ رہے ہوں وہ ہر وقت کسی مسافر کی طرح چلتے ہی محسوس ہوتے تھے اور چلنے والا اپنی رفتار میں پیچھے مڑکر دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ ایک بار قاضی سلیم مجھے کارٹر روڈ کے ایک کونے میں جوگرس پارک کے قریب کی پان کی دکان پر گم سم کھڑے نظر آگئے، میں نے اس حالت میں انھیں دیکھ کر پوچھا آخر ماجرا کیا ہے؟ وہ غمگین لہجے میں کہنے لگے: ''میں نے باقر کو اپنی نئی مثنوی کے کچھ حصے سنائے تھے جو انھیں پسند نہیں آئے اور اس ناپسندیدگی کی وجہ سے انھوں نے برسوں کی دوستی توڑ دی۔'' قاضی صاحب کافی حساس اور جذباتی مزاج کے انسان تھے۔ ان کو باقر مہدی کے رویے سے تکلیف پہنچی تھی جس کا اظہار انھوں نے یوں کیا: ''دوستی بننے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ اب میں اس عمر میں کہاں سے اتنا وقت لاؤں جو نئے دوست بناؤں۔'' اس علاحدگی کے باوجود اپنے ایک غیرمطبوعہ مضمون میں جسے سہ ماہی ''تکمیل'' نے گوشۂ باقر مہدی میں شامل کیا ہے، قاضی سلیم کے بارے میں ان کے جملے ہیں ''مہاراشٹر میں جدید نظم کے کتنے ہی شاعر ہیں مگر قاضی سلیم ان سب میں نمایاں اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں، انھوں نے اپنے دو تین شعری مجموعے رد کردیے تھے اور صرف ایک شعری مجموعہ ''نجات سے پہلے'' کے نام سے شائع کیا تھا۔''

باقر مہدی کا مزاج وکٹر ہیوگو کے مرکزی کردار سے مماثل تھا جو سرکاری حراست سے تو بچ جاتا ہے مگر اپنے احساس جرم سے نجات نہیں پاتا۔ وکٹر ہیوگو

نے اس کردار کے خارجی و باطنی تضاد کو جس خوبصورتی سے تجزیہ کیا ہے اسے دیکھ کر غالب کا ایک شعر یاد آتا ہے:

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

باقر مہدی کی رحلت کے بعد جتنے مضامین ان کے تعلق سے لکھے گئے ہیں (وارث علوی کے مضمون کو چھوڑ کر) ان سب میں اسی قسم کی یک طرفہ رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔ باقر مہدی جیسے دکھائی دیتے تھے اس کے سوا بھی بہت کچھ تھے لیکن اس بہت کچھ میں وہ کسی کو راز دار بنانے کے قائل نہیں تھے اور ان پر لکھنے والے اس بصارت سے اکثر عاری تھے جو خارج و باطن کے تضاد کی شناخت کر پاتے۔ اس بصارت کے لیے اس چشمے کی ضرورت ہے جسے پہن کر عصمت چغتائی نے ''دوزخی'' جیسا خاکہ لکھا تھا۔ عظیم بیگ چغتائی کی بیماری نے ان میں جو جھلاہٹیں پیدا کردی تھیں، وہ ایک دبیز پردے کی مانند تھیں جس کو ہٹا کر پورے کردار کی تفہیم کے لیے شاہد احمد دہلوی کے قلم سے زیادہ ایک بہن کے دل کی ضرورت ہے۔ ٹیگور کی ایک مشہور مکالماتی نظم میں ایک مجرم کی ماں بھری عدالت میں، منصف کو مخاطب کرتی ہوئی کہتی ہے: ''مجرم انسان کو اس کے جرم کی سزا دینے کے لیے منصف کے سینے میں ماں کا دل ہونا چاہیے۔'' باقر مہدی کی خارجی دل آزاریوں کو لوگوں نے دیکھا، ان دل آزاریوں کے پیچھے جو دلداریاں تھیں ان تک نظر کی رسائی مشکل تھی۔ باقر مہدی نے قاضی سلیم پر لکھتے ہوئے ایک اہم مسئلے پر سوالیہ نشان بنایا ہے: ''قاضی سلیم دو شخصیتوں کے مالک ہیں۔ سیاست میں وہ حکمراں طبقے کے ساتھ ہیں اور شاعری میں establishment کے خلاف۔ ان کے شخصی تضادات نے ان کی شاعری کو ایک انوکھے تناؤ سے نوازا ہے۔''

باقر مہدی نے قاضی سلیم کے تعلق سے جن تضادات کی بات اٹھائی ہے وہ مختلف سطحوں پر باقر مہدی کی نثری و نظمیہ تحریروں میں تناؤ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے اردگرد جو ہو رہا تھا وہ اس سے بیزار بھی تھے اور جو ہونا چاہیے اس کے نہ ہونے کے ماتم گسار بھی تھے۔ ان کے فکری تضادات نے ان کے لفظوں کو نئی حرارت اور مختلف شعری ہیئت کے قریب کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری اپنے ہم عصروں سے مختلف بھی ہے اور اردو شعری روایت میں نئی قرأت پر اصرار بھی کرتی ہے۔ جانچ پرکھ کے مستعمل تنقیدی tools اس کی پہچان کے لیے ناکافی ہیں۔

اک آگ سی جلتی رہتی ہے رگ رگ میں مری/ اک بے معنی سا درد مرا
احساس جگاتا رہتا ہے/ اس طرح کہ میں سب کچھ یوں ہی محسوس کروں
اور کچھ نہ کہوں/ جب تک یہ جہنم روشن ہے/ میں زندہ ہوں
(جہنم)

دوست ہو جائیں الگ ...... لیکن/ ایک مدت تک تڑپتے ہیں سلگتی ریت پر/ زرد پھول (زرد پھول)

یہ بھی تو ممکن ہے لیکن/ میں بھی اک خاکہ بن جاؤں/ جس کو دیمک چاٹ رہی ہو

باقر مہدی کی یادداشت بے پناہ تھی، وہ جو کچھ پڑھتے تھے اس میں کتاب کے مصنف کے نام، کتاب کے ٹائٹل، حوالوں کے صفحات کتاب میں کہی گئی بات تفصیل کے ساتھ انھیں یاد ہوتی تھی۔ وہ گھریلو گفتگو، محفل میں تقریر کرتے ہوئے کسی لائبریری کیٹلاگ کی طرح نظر آتے تھے۔ ان کی پڑھائی شعور کا حصہ زیادہ تھی، اس میں لاشعور کا جزو بننے کی کیفیت کم محسوس ہوتی ہے۔ جہاں شعور و لاشعور ارتباط و امتزاج ممکن ہوسکا، وہاں ان کی شاعری اس وصف سے آسودہ دکھائی دیتی ہے جسے فراق اپنے مخصوص انداز میں گمشدگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ باقر مہدی نے اپنی کئی نظموں میں انسومنیا کا ذکر کیا ہے (انسومنیا نیند نہ آنے کا مرض ہے) ان کی ایک نظم 'انسومنیا کی تیسری شب' کے مصرعے ہیں:

انسومنیا کی تیسری شب ہے/ وہ آنکھیں/ چمک چمک کر/ مجھ سے باتیں کرتی ہیں

باقر مہدی کی مجموعی شاعری میں جگار کا اضطراب زیادہ ہے، غنودگی کا خواب کم ہے۔ یہ جاگتی آنکھوں کی شاعری ہے جس میں الفاظ بھی اس غنائیت سے دور ہیں جو اردو کا عمومی تعین ہے۔ شہر آرزو کے بعد کی ان کی بیشتر نظموں اور غزلوں میں اس متعین رویے سے گریز نظر آتا ہے۔ باقر جاگتی آنکھوں سے سپنے دیکھنے اور ان کو انجھے تشنہ لفظوں سے دکھانے کے شاعر ہیں۔ انھی کی انسومنیا پر ایک اور نظم میں یہ مصرعے ملاحظہ ہوں:

انسومنیا کی نظمیں تو/ اک مدت سے/ تو نے آدرشوں کے سپنے ڈھونڈ رہی ہیں

چارواکیہ، کارل مارکس، لینن، ایپی کیورس اور بدھ کی مانند باقر بھی خدا کے کسی مذہبی تصور کے قائل نہیں تھے لیکن کائنات میں وہ تاریخی ہستیاں ان کی آدرش ضرور تھیں جو حق و باطل کی جنگ میں حق کی طرفدار رہی ہیں۔ حق کی طرفداری کا اظہار ان کی تنقید اور شاعری میں کئی جگہ ملتا ہے۔ اس طرفداری کو باقر نے اپنی روحانی قوت بنایا تھا اور یوں مسلسل کربنا کیوں کے عذاب کو آسان کرنے کی سعی کی تھی۔ وہ یگانہ کے پرستار تھے جنھوں نے کہا تھا:

سب ترے سوا کافر آخر اس کا مطلب کیا
سر پھرا دے انساں کا ایسا خبطِ مذہب کیا

لیکن یگانہ کے برعکس انھوں نے اپنے لیے ایک مذہب کی تعمیر کر کے اپنی سماجی و تہذیبی ذمے داری کا ثبوت دیا تھا:

ہم پولیس بن کے بہت جی چکے مگر
یارو حسین بن کے بھی مر جانا چاہیے

اسی مذہبی رجحان نے انھیں ایمرجنسی کی مخالفت پر مجبور کیا، اسی نے ان کے مکان پر چے گوارا کی بڑی سی تصویر آویزاں کرنے پر آمادہ کیا۔ اسی کی وجہ سے مرادآباد کے فسادات کے خلاف انھوں نے آواز بلند کی، اسی کے کارن، افغانستان میں بدھ کی مورتیوں کے انہدام کو انھوں نے بنیاد پرستی ٹھہرایا، اسی کی وجہ سے انھوں نے ویت نام پر امریکی جارحیت کو مجرم لکھا، اسی رویے کی دین تھی ان کی نظم، ارکیڈیا میں، میں ایک ساتھ بدھ، عیسیٰ، مارکس، غالب، دوستوفسکی، کافکا اور کامیو کی موجودگی، اسی پختہ عقیدت نے ان سے وان گاف پر نظم لکھوائی اور اسی کی بنا پر انھوں نے ایک کالا نوحہ میں گاندھی کے آخری لفظ ''ہے رام'' کو دہرایا۔ ان کا یہ بدلا ہوا روحانی مزاج جو ان کی شاعری کا مرکزی محور تھا، ہم عصر تنقید میں توجہ کا سبب نہ بنا ہو لیکن ہندوستان کے ایک بڑے دانشور شیام لال کے وہ الفاظ جو ان کی انگریزی کتاب "A Hundred eneo" کے دیباچے میں شامل ہیں وہ باقر کے ادبی معیار کی ضمانت ہیں۔ شیام لال نے لکھا ہے'' باقر اردو کے نقاد شاعر ہیں، جن کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوسکی۔''

❑❑❑

پتہ:
Sunrise, 201-B,
Aramnagar, Versova,
Mumbai-400061

فانی بدایونی (جدید ایڈیشن)

مصنف: مغنی تبسم

اردو غزل کے احیائے جدید میں فانی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے اس کتاب میں فانی کی حیات، شخصیت اور شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے فانی کے ناقدین و محققین، عزیز و اقارب، احباب اور جاننے والوں سے شخصی ربط پیدا کر کے ان سے متعلق اہم معلومات یکجا کر دی ہے اور شاعر کے فن کے تجزیے کے لیے لسانیات کی اہم شاخ ''اسلوبیات'' کے ذریعے کلامِ فانی کے صوتی آہنگ کا دلچسپ مطالعہ کیا ہے جو اردو شعر و ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی باضابطہ کوشش ہے۔

صفحات: 499، قیمت: -/210 روپے

مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے

مصنف: مرزا محمد زماں آزردہ

مرزا سلامت علی دبیر انیسویں صدی کے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے مرثیہ گوئی کو ایک نئی تب و تاب عطا کی اور ایک منفرد لب و لہجے سے ہم کنار کیا۔ ان پر ابھی تک جو کچھ بھی تحقیقی مواد فراہم ہوسکا ہے وہ بڑی حد تک تشنہ ہے۔ اس کتاب میں دبیر کے حالاتِ زندگی، شعری کارنامے، مراثی کی روایت، کلام دبیر کی اہم خصوصیات، ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی اور ان کے ادبی مرتبے کے تعین کے ذریعے اس تشنگی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 592، قیمت -/258 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

ابوبکر عباد

حسرت موہانی — شاعری کی ریاست کا حزب مخالف

حسرت موہانی کی شخصیت مجموعۂ تضادات تھی۔ وہ بیک وقت جنوں خیزی سے سرشار انقلابی تھے اور انتہائی سادہ اور معصوم انسان بھی۔ وہ باغی تھے اور اصولوں کے پابند بھی۔ تربیت یافتہ صحافی تھے اور سرگرم حریت پسند بھی۔ فعال سیاست داں تھے اور صوفی منش انسان بھی۔ پکے مسلمان تھے اور سچے اشتراکی بھی۔ محقق تھے اور عاشق بھی۔ شاعر تھے اور بیوپاری بھی۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے اور علی گڑھ تحریک کے پہلے مخالف بھی۔ انھوں نے مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس میں شرکت کی دعوت دی، اور خود بعد میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی۔ وہ جس پارٹی یا جماعت میں رہے اس میں حزب مخالف کا کردار ادا کیا، کہ مصلحت پسندی اور بزدلی ان کی سرشت میں نہ تھی۔ 1921 میں احمد آباد کے کانگریس اجلاس میں مہاتما گاندھی کے ہوم رول کے مقابلے میں انھوں نے مکمل آزادی کی تجویز پیش کی، اور جب 6رجنوری 1949 کو قانون ساز اسمبلی میں ہندوستان کا دستور منظوری کے لیے پیش کیا گیا تو یہ تنہا ممبر پارلیمنٹ تھے جنھوں نے اسے منظور کرنے سے انکار کیا لیکن دلچسپ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان تضادات نے ان کی شخصیت میں نہ تو کسی طرح کا سقم پیدا کیا، نہ رویوں میں منافقت آنے دی۔ انھیں اپنی اس تضاد خیالی کی وجہ سے نہ تو کسی کے سامنے شرمسار ہونا پڑا، نہ کبھی وہ احساس جرم کا شکار ہوئے۔ بلکہ ان تضادات نے ان کے مزاج میں استحکام پیدا کیا، خود اعتمادی کی دولت بخشی اور ان کی شخصیت کو پرشکوہ بنایا۔ تعجب ہے کہ اس ایک شخص نے اتنے سارے تضادات کو کیسے زندگی بھر نبھایا۔

فی الوقت شاعر حسرت پر گفتگو کا قصد نہیں، حسرت کی شاعرانہ جہت کا تجزیہ مقصود ہے۔ حسرت نے نہ تو آخرت میں وسیلۂ نجات بننے والے مرثیے لکھے، نہ دنیا میں خلعت واکرام دلوانے والے قصائد، نہ دیو پری اور شہزادے اور شہزادیوں کے طولانی قصے سنانے والی مثنوی میں طبع آزمائی کی، نہ تہذیب وثقافت کی عکاسی کرنے والے گیت لکھے، اور نہ ہی مربوط فکر وخیال کو بیان کرنے والی دلچسپ ودلفریب نظم کا سہارا لیا۔ بلکہ حسرت نے اس صنف کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا جسے ترقی پسند جوش نے ناپسند کیا، مغرب پرست کلیم الدین احمد نے نیم وحشی صنف سخن سے تعبیر کیا اور جسے مدھ بھرے ہندی گیتوں کے رسیا عظمت اللہ خاں نے گردن زدنی قرار دیا:

لکھتا ہوں مرثیہ، نہ قصیدہ نہ مثنوی
حسرت غزل ہے صرف مری جان عاشقاں

حسرت نے غزل کے اسالیب کا مطالعہ کیا تھا، اس کی روایت کو سمجھا تھا اور اس کے موضوع اور طرز اظہار سے دلی مناسبت محسوس کی تھی:

عشق حسرت کو ہے غزل کے سوا
نہ قصیدے نہ مثنوی کی ہوس

ریزہ خیالی اور متضاد موضوعات کی بنیادی صفت رکھنے والی غزل کو حسرت نے بھلے ہی شعوری طور پر حرز جاں بنایا ہو، لیکن اسے تضادات سے تشکیل پائی ہوئی ان کی شخصیت، ان کے تلون پسند مزاج اور ان کی نفسیات کا لاشعوری انتخاب کہنے سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

حسرت کی شخصیت اور شاعری پر ان کے عہد سے لے کر ہمارے زمانے تک کے بڑے لکھنے والوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، جن میں بلند پایہ محقق بھی ہیں، معروف مدیر بھی۔ قدآور ناقد بھی ہیں بہترین نثر نگار بھی۔ ان کے ہم عصر شاعر بھی ہیں مشہور ادیب بھی۔ یونیورسٹی کے اساتذہ بھی ہیں اور دینی مدارس کے معلمین بھی۔ ان تمام لوگوں نے ان کی شاعری کو اپنی اپنی میزان نقد پر پرکھا اور اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اس کی تحسین وتنقید کی ہے۔ عبدالقادر سروری نے حسرت کی شاعری کو اردو غزل کا احیا بتایا تو پروفیسر آل احمد سرور نے اسے اردو غزل میں ایک خاموش انقلاب سے تعبیر کیا۔ جعفر علی خاں اثر نے ان کی شاعری میں 'لکھنؤ کی زبان اور متقدمین ومتوسطین شعرائے دہلی کے تخیل کے بہترین امتزاج کی نشاندہی کی، تو عبادت بریلوی نے ان کی شاعری میں حسن اور حسن پرستی کے تصورات دریافت کیے۔ فراق گورکھپوری نے ان کی غزل کو ایک نہایت تربیت یافتہ اور رچے ہوئے ذوق کا نتیجہ بتایا تو یوسف حسین خاں نے حسرت کی غزل کو عشق ومحبت کی قلبی وارداتوں اور اس کی جاودانی کیفیتوں کی داستان کہا اور خود حسرت کو اس داستان کا ہیرو قرار دیا۔ کلیم الدین احمد نے انھیں 'صاحب طرز شاعر' کا خطاب دیا اور سید سلیمان ندوی نے انھیں 'غزل کو لکھنؤ کے تصنع اور غالب کی مشکل گوئی کے کوچے سے سادگی، آسانی اور حقیقت رسی کی منزل تک پھیر کر لانے والا مجدد' جانا۔ رشید احمد صدیقی کا خیال تھا کہ غزل گوئی کوئی کرے غزل کا معیار حسرت ہی رہیں گے، لیکن علامہ نیاز فتح پوری کے مطابق 'حسرت کی شاعری یکسر جذبات کی شاعری ہے، جو ہر عمر کے مختلف حصوں کے ساتھ ابھری ٹھہری اور ختم ہوگئی'۔ ایک رائے مولانا عبدالماجد دریابادی کی بھی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''حسرت اپنے وقت کے ایک بہترین شاعر تھے۔ کلام عاشقانہ تھا،

فاسقانہ نہ تھا۔شوخی تھی، بے حیائی نہ تھی۔رندی تھی، اوباشی نہ تھی۔شعر جتنا اچھا کہتے تھے اتنا ہی اچھا پرکھتے بھی تھے''۔

ان مشاہیر کے تنقیدی یا تحسینی خیالات کا نہ تو موازنہ کرنا مقصود ہے،اور نہ ہی ان کے سہارے حسرت کو'شاعر اعظم' 'رئیس المتغزلین'، 'نئی غزل کا امام' یا اپنے عہد کا سب سے منفرد اور ممتاز شاعر ثابت کرنا ہے۔مشاہیر کی رائیں تو دراصل طویل اقتباسات اور صفات کے بیجا اصراف سے بچنے کی خاطر ان کے پرمغز مقالوں اور تحقیقی اور تنقیدی مضامین سے کشید کیے ہوئے جوہر ہیں جو حسرت کی شخصیت اور ان کی شاعری کی تفہیم میں کسی قدر معاون ہو سکتے ہیں۔گو کہ ان حضرات کے مقالے صداقت سے زیادہ ستائش اور متوازن تنقید سے زیادہ مبالغہ آمیز تحسین پر مبنی ہیں۔

حسرت کے بیشتر ناقدین نے انھیں نئی غزل کا امام، جدید غزل کا بانی، روایتی غزل کا منحرف اور غزل کی نئی تحریک کا موجد قرار دیا ہے، جو سچ نہیں ہے۔ان ناقدین کو نہ تو کوتاہ بیں، متعصب یا بے خبر کہا جا سکتا ہے نہ ہیرو پرست، کہ مشرقی اخلاقیات میں یہ طرز گفتگو گستاخی ہی نہیں گناہ عظیم ٹھہرتی ہے۔ لیکن یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ اس نوع کے فیصلے گمراہ کن اور معیوب ہوتے ہیں۔نئی غزل کے احیا کا سہرا حسرت کے سر نہیں، یہ واقعہ ان سے پہلے کا ہے۔روایت ہے کہ خواجہ الطاف حسین حالی کی تنقید کے بعد دوسرے تیسرے درجے کے شاعروں کا تو خیر کیا ذکر معتبر اور مستند شاعروں تک نے غزل کہنی ترک کردی تھی اور غالباً اردو کی پوری تاریخ میں غزل پر اس سے پہلے ایسا سخت وقت کبھی نہ پڑا تھا، کہ اس کے خالقوں نے اس کی پرورش سے منھ موڑ لیا ہو اور اس کے عاشقوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔ایسے پیغمبرانہ وقت میں تنہا شاد عظیم آبادی تھے جو غزل کی نہ صرف پرورش و پرداخت میں مصروف تھے بلکہ اس کی ناز برداری اور اس کی تزئین و تطہیر بھی کر رہے تھے، کہنا چاہیے کہ اس جاں کنی کے عالم میں اردو غزل کو اگر کسی نے نئی زندگی بخشی اور نیا روپ دیا تو وہ حسرت نہیں شاد عظیم آبادی تھے۔ پروفیسر شمس الرحمان فاروقی کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''طالب علمی کے زمانے میں ہمیں یہ بتایا گیا تھا کہ حسرت غزل کے احیا کے امام ہیں۔اچھا اب ہم تاریخ دیکھیں تو پتہ لگتا ہے کہ حسرت موہانی تو شاد عظیم آبادی کے تیس چالیس سال بعد پیدا ہوئے۔...لہٰذا جب حسرت ہمارے سامنے آئے اس وقت شاد کی غزل پوری تابناکی اور شوکت و شان کے ساتھ جلوہ گر تھی۔اچھا جب شاد جیسا غزل گو موجود تھا تو پھر ہم حسرت کو یہ لقب کیوں دیں کہ وہ غزل کے احیا کے امام تھے؟ شاد کے ہوتے کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ غزل کا زوال ہو گیا تھا اور اس کے احیا کی ضرورت تھی اور حسرت نے وہ کام کیا۔''(شب خون: الہ آباد)

اس سلسلے کا ایک اور اقتباس مظہر امام کی تحریر سے ملاحظہ فرمائیے:

''بیسویں صدی میں اردو غزل میں نئی تحریک کے جو آثار پیدا ہوئے ان کا موجد حسرت کو ہی سمجھا جاتا ہے اور اسی لیے انھیں جدید غزل کا امام کہا گیا ہے۔لیکن حسرت کو یہ اعزاز بخشنے والے بھول جاتے ہیں کہ حسرت سے پہلے تغزل کی ساری روایتوں اور دل کشیوں کو برقرار رکھتے ہوئے اردو غزل ایک نئے مزاج اور ایک نئی جہت سے آشنا ہو رہی تھی اور یہ مزاج عطا کرنے والے شاد عظیم آبادی تھے۔شاد نے تھکا دینے والی یکسانیت، بے رنگی اور سطحیت سے اردو غزل کو نکالا، جس میں یہ گرفتار تھی اور جس کے خلاف حالی نے نعرۂ بغاوت بلند کیا تھا''۔(زبان و ادب: پٹنہ: شاد عظیم آبادی نمبر: ص 15)

البتہ یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ حسرت نے غزل میں عشقیہ جذبات کو جس طرح داخل کیا، غزل میں جس طور جنس کی تہذیب و تطہیر کی، محبت کے اظہار کا جو سلیقہ اپنایا اور عاشق و محبوب کے رکھ رکھاؤ کو غزل میں جس خوبی سے برتا وہ صرف اور صرف حسرت کا ہی امتیاز ہے۔

حسرت نے اساتذہ کے کلام کا کثرت سے مطالعہ کیا تھا۔اور یہ مطالعہ انھوں نے شاعری سے محض لطف اندوز ہونے یا حصول انبساط کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ان کے پیش نظر دو چیزیں یقیناً تھیں۔ایک تو یہ کہ انھوں نے زبان کے استعمال اور لفظوں کے انتخاب پر توجہ مرکوز کی، اور دوسرے یہ کہ اشعار میں بیان کیے گئے مضامین اور سلیقۂ اظہار کا تنقیدی جائزہ لیا۔نتیجے کے طور پر انھوں نے اپنی شاعری میں دو باتوں کا بطور خاص خیال رکھا۔اول بیان کی سطح پر صحت زبان، محاورات کے صحیح استعمال، نازک خیالی اور سادہ بیانی کو اپنایا، دوم فکر کی سطح پر انھوں نے مثبت کی بجائے منفی طریقۂ کار پسند کیا، یعنی اساتذہ کے کلام کے مطالعے کے بعد انھوں نے یہ طے کیا کہ اساتذہ کے کلام کی کن کن چیزوں سے انھیں اپنی شاعری کو محفوظ رکھنا چاہیے۔چنانچہ انھوں نے میر کے یہاں سے سادگی لی اور ان کی غم کوشی اور یاسیت سے پرہیز کیا، مومن کا تغزل اختیار کیا لیکن ان کے رقیب، واسوخت کے انداز اور رعایت لفظی سے بچنے کی کوشش کی، داغ سے زبان کی صفائی، سلاست اور سحر آفرینی اخذ کی لیکن ان کے بازاری عشق کے بیان سے دور رہے اور جرأت اور انشا سے بے باکی لی اور ان کی شوخی، پھکڑ پن اور ابتذال سے اغماض برتا۔اپنے اس تنقیدی شعور سے وہ آخر تک کام لیتے رہے، چنانچہ ان کی شاعری کی زبان بڑی صاف، شائستہ اور دلنشیں ہے، لہجہ منفرد اور خیالات و مضامین عمدہ ہیں۔ان کے ابتدائی کلام میں جہاں تسلیم، نسیم اور مومن کا ذکر ہوتا تھا، بتدریج سعدی، مولانا روم، حافظ، جامی، شمس تبریزی، میر، قائم، مصحفی، اور غالب کے نام شامل ہوتے چلے گئے، اور حسرت کا کلام بھی پہلے سے زیادہ شگفتہ اور پختہ تر ہوتا گیا۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

پیرو تسلیم ہوں، شیدائے انداز نسیم
شوق ہے حسرت مجھے اشعار حسرت خیز کا

حسرت مرے کلام میں مومن کا رنگ ہے
ملکِ سخن میں مجھ سا کوئی دوسرا نہیں

شعر سے تیرے ہوئی مصحفی و میر کے بعد
تازہ حسرت اثر و حسنِ بیاں کی رونق

حسرت اردو میں ہے غزل تیری
پرتوِ نقشِ سعدی و جامی

مجھے فیضِ سخن پہنچا ہے حسرت
زروحِ پاکِ شمس الدین تبریز

ہم جامی و حافظ کے بھی قائل ہیں پہ حسرت
خوبی میں نہ پہنچا کوئی سعدی کی غزل تک

غالب و مصحفی و میر، نسیم و مومن
طبعِ حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

اردوشاعری کوحسرت کی دین یہ ہے کہ انھوں نے غزل کو سچ بولنا سکھایا،محبت کے آداب بتائے اورمحبوب کی نفسیات سے روشناس کرایا۔وہ حسن بیان اور اظہارعشق کے شاعر ہیں،اورجسم و جمال اور جذبہ واحساس ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ ان کی شاعری میں کسی عمیق فلسفے، بلند خیال یا اہم فکر کی تلاش بے سود ہوگی۔بعض ناقدین نے حسرت کی شاعری میں فلسفے کی نشاندہی کی کوشش اور لاادریت کی جو بحث کی ہے وہ دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے،جب کہ خودحسرت نے اس کارلا حاصل سے منع کیا تھا،یقین نہ آئے تو یہ اشعار دیکھیے:

سہل کہتا ہوں ممتنع حسرت
نغز گوئی مرا شعار نہیں

شعرِ دراصل ہیں وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

شعر حسرت نے سارے کھول دیے
عشق بازی کے عقدہ ہائے ادق

دامنِ شعرِ عشق پر حسرت
داغِ اہمال و ابتذال نہیں

حسرت کی تمام تر شاعری محض تین موضوعات کومحیط ہے:عشق،سیاست اورتصوف۔اس میں شک نہیں کہ حسرت صوفی منش تھے۔خلق اللہ سے محبت کرتے تھے،اوراولیا اورصوفیائے کرامؒ سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔انھوں نے خودلکھا ہے کہ’’میں قدامت پسندسنی اورصوفی ہوں۔تصوف کو مذہب کا جوہرسمجھتا ہوں اورتصوف کا حاصل میرے نزدیک عشق ہے‘‘۔(بحوالہ نیاز فتح پوری :حسرت کی خصوصیات شاعری؛نگار حسرت نمبر،1952)لیکن خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں کہ:

’’حسرت کی زندگی اور ان کے مشاغل کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ کوئی صوفی نہ تھے،اورنہ انھیں باشعورطریقے پرتصوف کواپنا کراس پرعامل ہونے اور اپنے دل کوجذب وسرور سے مملوکرنے کا موقع ملا۔وہ محض بڑے صوفیوں سے عقیدت رکھتے تھے اور ہر سال اجمیرشریف،کلیرشریف،بہرائچ،فرنگی محل اور دوسرے مقامات پر جاکرصوفیائے کرام کے عرسوں میں شریک ہوتے تھے۔اور ان کی شاعری میں صرف اسی عقیدت مندی کے اظہارکا نام تصوف ہے۔‘‘

(فکروفن،ص:90)

تصوف سے متعلق ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

ہر نغمے نے انھیں کی طلب کا دیا پیام
ہر سانس نے انھیں کی سنائی صدا مجھے

کرو کچھ تو ارشاد یا غوث الاعظم
سنو میری فریاد یا غوث الاعظم

ہم بھروسے پہ ان کے بیٹھ رہے
جب کسی کا بھی آسرا نہ رہا

دل کو خیالِ یار نے مخمور کر دیا
ساغر کو رنگِ بادہ نے پر نور کردیا

حسرت پھر اور جاکے کریں کس کی بندگی
اچھا جو سر اٹھائیں بھی اس آستاں سے ہم

عقدہ وصالِ یار کا حل ہو تو جانیے
خوف و خلوص و علم و عمل ہو تو جانیے

ظاہر ہے حسرت جیسے زودحس اورغیرمستقل مزاج شخص سے نہ تو میردرد کے مرتبے کے صوفیانہ اشعار کہنے کی توقع کی جاسکتی ہے نہ ان کے ہم عصرجگر کے سے کیف وسرور سے مملوغزل گوئی کی امید،کہ حسرت صوفیا کی کرامات سے تو واقف تھے تصوف کے رمزآشنا نہ تھے۔

حسرت کی شاعری کا دوسرا موضوع سیاست ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ حسرت کی شاعری کا سب سے پھیکا رنگ بھی یہی ہے۔جب کہ حسرت کی سیاسی دلچسپی کالج کے زمانے سے ہی شروع ہوگئی تھی۔وہ عمربھر ہندوستان کی سیاست میں عملی طور پر شریک رہے اور مختلف سیاسی تنظیموں سے وابستہ بھی رہے۔ ان کی زندگی میں ہی ہندوستان میں کئی اہم واقعات رونما ہوئے۔ مثلاً کانگریس کی تحریک آزادی،جلیاں والا باغ کا حادثہ،خلافت تحریک،دوسری جنگ عظیم ،بنگال کا قحط،ستیا گرہ،تقسیم ملک اوراس کے نتیجے میں رونما ہونے

والے خونریز فسادات وغیرہ۔ ان میں سے کئی واقعات میں حسرت بذات خود شریک رہے اور بعض واقعات کا بہت قریب سے مشاہدہ بھی کیا لیکن حسرت کی شاعری میں ان واقعات کی گرمی، غصہ اور دھمک تو کیا، آہٹ تک محسوس نہیں ہوتی۔ یقیناً کسی شاعر سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اپنی شاعری میں اپنے عہد کی حسیت کی عکاسی کرے یا اپنی آئڈیالوجی، اور باغیانہ اور سیاسی خیالات کو زندگی کے تمام شعبوں میں تغیر اور انقلاب کے نعرے بنا کر پیش کرے درست نہیں لیکن فیض، فراق، مجروح اور مخدوم کی طرح رمز و کنایے کی زبان میں اپنے عہد اور سیاسی اور سماجی کش مکش کی صدائے بازگشت کسی شاعر کے کلام میں سنائی دے تو اسے شعر کی عظمت اور شاعر کی بڑائی سمجھنا چاہیے۔ اس جگہ یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ یہ عظمت اور یہ بڑائی حسرت کی شاعری میں تقریباً مفقود ہے۔ ان کے سیاسی نوعیت کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

ابھی ہم کو سمجھے نہیں اہل مغرب
بتا دو انھیں گرم پیکار ہو کر
غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی
جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں ہے
اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلیِ ہم رہاں سے ہم

ایک دلچسپ تقابل شاید یہاں غیر ضروری نہ ہو، حسرت اور اقبال کا زمانہ ایک تھا، حسرت نے بھی جدید تعلیم حاصل کی تھی، اساتذہ کے کلام کا بغور مطالعہ کیا تھا، ملک کے سیاسی حالات سے دلچسپی رکھتے تھے اور شاعری کرتے تھے۔ اقبال نے بھی اساتذہ کا کلام پڑھا تھا، جدید تعلیم حاصل کی تھی اور شاعر تھے۔ علاوہ ازیں اقبال نے فلسفہ، تاریخ اور اقوام عالم کی تہذیب و ثقافت کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، اور نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تعلیمی حالات سے بھی باخبر تھے اور کہنے کی ضرورت نہیں کہ دراصل شخصیتوں کا یہی فرق ہے جس نے ایک غیر سیاسی، گوشہ نشیں اور قدرے آرام پسند آدمی کو حرکت و عمل، قوم و وطن، آزادی و سیاست، اور عالم انسانیت کا شاعر بنا دیا، جب کہ ایک سیماب صفت، فعال، اور عملی سیاست میں حصہ لینے والے پرجوش عوامی لیڈر کو عشق و عاشقی اور گھر آنگن کی شاعری سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ یہ تسلیم کہ حسرت کی شخصیت میں وہ عناصر نہ تھے جو کسی شخص کو مدبر، مفکر، فلسفی اور مسائلِ حیات کا ادراک رکھنے والا بناتے ہیں، لیکن حسرت کے خلوص، ان کی سچائی اور غزل سے ان کی محبت پر شک نہیں کیا جا سکتا، کہ جیل کی انتہائی سختیوں میں بھی انھوں نے غزل کو سینے سے لگائے رکھا اور اپنے خونِ جگر سے اس کی آبیاری میں مصروف رہے:

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت کی شاعری کا تیسرا، اہم اور سب سے پر اثر موضوع عشق ہے۔ حسرت کی شاعری کا عاشق متوسط طبقے کا مہذب نوجوان ہے جسے عشق کے وہ تجربات حاصل ہیں جن سے حسرت کے ہم عصروں اور ان کے ماقبل شاعروں کے کردار محروم ہیں۔ حسرت کی شاعری کے عاشق کے یہاں نہ تو تشنگی ہے، نہ محرومی اور نہ وہ سماج کی بندشوں میں جکڑا ہوا ہے بلکہ اسے بھرپور آسودگی، آزادی اور محبوب کی قربت حاصل ہے۔ نارمل عاشق کا ایک مہذب سماج میں ایسا کامیاب اور سچا عشق کسی اور شاعر کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ ایسی ہی حسرت کی شاعری کی محبوبہ ہے۔ ماورائی نہیں حقیقی، گوشت پوست کی، زندہ اور متحرک۔ حسرت کے ماقبل شاعروں کے یہاں ہم محبوبہ کو بیک وقت مجسم نہیں دیکھتے ٹکڑوں یا قسطوں میں دیکھتے ہیں۔ کبھی اس کی زلف دیکھتے ہیں، کبھی گال۔ کبھی صرف اس کے ہونٹ نظر آتے ہیں، کبھی رخسار۔ کبھی محبوب کے دہن کی زیارت ہو جاتی ہے، کبھی نیم باز یا مخمور آنکھوں کی۔ کبھی صرف پلکوں یا بھوؤں کی جھلک دکھتی ہے کبھی کاکل کی۔ کبھی محبوب کی محض آواز کانوں میں پڑتی ہے، کبھی اس کے کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی ہے اور جو کبھی اس کا سراپا نظر آیا بھی تو چہرہ نہیں، چہرہ دکھا تو جسم نہیں۔ حسرت کی محبوبہ ایسی نہیں، وہ تو گھر آنگن کی لڑکی ہے، پاس پڑوس کی دوشیزہ ہے، رشتے کی عم زاد ہے اور ہم جیسی انسان ہے۔ وہ ستم پیشہ، جفا کار اور عیار نہیں۔ باحیا، معصوم اور نوخیز ہے۔ جو کبھی چھپ چھپا کر، موقع نکال کر، گھبرائی سہمی عاشق سے ملنے آجاتی ہے، اور کبھی آنکھوں اشاروں میں محبوب سے باتیں کر لیتی ہے۔ حسرت کی شاعری کے عاشق و محبوب دونوں کی رگوں میں گرم خون کی روانی ہے، اور عنفوانِ شباب کی سرمستی ہے، ان کے کچھ مادی اور جسمانی مطالبے ہیں جو ان کے جذبات میں ہیجان پیدا کرتے ہیں، ذوقِ جنوں کو بڑھاتے ہیں، دونوں ایک دوسرے کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور کامیاب بھی ہوتے ہیں:

بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا
اب تو اظہارِ محبت برملا ہونے لگا
بار بار اٹھنا اسی جانب نگاہِ شوق کا
اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے
غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے
اے شوق کی بے باکی وہ کیا تری خواہش تھی
جس پر انھیں غصہ ہے، انکار بھی حیرت بھی

مجھ سے تنہائی میں گر ملیے تو دیجیے گالیاں
اور بزمِ غیر میں جانِ حیا ہو جایئے
دن کو ہم ان سے بگڑتے ہیں، وہ شب کو ہم سے
رسم پابندیِ اوقات چلی جاتی ہے

اور یہی نہیں حسرت اپنے محبوب کی نفسیات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس کا مکمل سراپا اور اس کا پورا وجود آنکھوں میں پھر جاتا ہے، اور اس کے کردار کے ایک ایک خال و خد پوری طرح واضح ہوجاتے ہیں۔ اس ہنر میں حسرت کا جواب نہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے
مجھے گرم نظارہ دیکھا تو ہنس کر
وہ بولے کہ اس کی اجازت نہیں
اب جو بگڑے تو خوشامد نہ کریں گے ہم بھی
کہ منانے سے وہ کچھ اور خفا ہوتے ہیں
بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے
ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا
دیکھا جو مجھے گرم نظر بزمِ عدو میں
وہ ڈانٹ گئے مجھ کو برابر سے نکل کر
سر کہیں، بال کہیں، ہاتھ کہیں، پاؤں کہیں
ان کا سونا بھی ہے کس شان کا سونا دیکھو

اس سلسلے میں بیشتر نقاد متفق ہیں کہ حسرت سے پہلے جلال، امیر مینائی اور داغ کی شاعری کے محبوب میں طوائف کی جھلک دکھائی دیتی تھی، اور ان سے پہلے کے محبوب ماورائی یا تصوراتی تھے، جب کہ حسرت کی شاعری کا محبوب خیالی یا بازاری نہیں حقیقی اور سماجی ہے۔ عاشق بھی اسی دنیا کا عام انسان ہے، اور دونوں کی محبت مہذب اور سچی ہے اور یہ کہ عاشق و محبوب اور عشق کی ایسی تصویر کشی حسرت کی جدت ہے۔ اسے حسرت کی جدت کہنا تو صحیح نہیں، ہاں ان کی ہمت یا حقیقت پسندی کہنے میں کوئی حرج نہیں، کہ حسرت اس قدیم یونانی نظریے کے حامل تھے کہ 'مصوری اور شاعری میں حقیقت کی ہو بہو نقل اتاری جاتی ہے، سو حسرت نے بھی اپنی شاعری میں اپنے عہد کے سماج یا اپنے عشق کی ہو بہو نقل اتاری ہے اور یہ طریقہ نہ ماقبل شعرا سے مختلف ہے نہ نیا۔ فرق صرف یہ ہے کہ ماقبل شعرا نے تصور میں بسے محبوب اور خیالی عشق کی نقل اتاری یا عشوہ طراز طوائفوں کی جھلک دکھائی، اور حسرت نے مہذب گھرانے کے حقیقی محبوب اور سچے عشق کی تصویر کشی کی۔ اب حسرت کی تحریر سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''اربابِ نظر نے شاعری اور مصوری کو ایک ہی قبیل سے قرار دیا ہے۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ جس طرح کامیاب مصوری کے لیے لازم ہے کہ جس چیز کی نقل اتاری جائے، وہی ہو بہو تصویر میں نظر آئے۔ اسی طرح سے حقیقی شاعری کے لیے بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ واقعاتِ محبت کے بیان میں تصنع سے کام نہ لیا گیا ہو اور جذبات کی صحیح ترجمانی کی گئی ہو، عام اس سے کہ وہ جذبات علوی ہوں یا سفلی۔ اگر جذبات عالی ہوں گے تو شاعری جذبہ نگاری اور واقعہ نگاری کی شکل اختیار کرلے گی، ورنہ یہ معاملہ بندی ہو جائے گی۔ اور ہمارے نزدیک یہی تینوں چیزیں شاعری کا بہترین نمونہ ہیں۔''
(بحوالہ کلاسیکی شاعری: ایم۔ حبیب خاں: انڈین بک ہاؤس: علی گڑھ: ص 31)

گویا حسرت شاعری کی روایت میں کوئی جدت نہیں پیدا کر رہے تھے، بلکہ قدیم نظریے کے مطابق بغیر کسی تصنع کے 'واقعات محبت' اور جذبات کی ہو بہو عکاسی کر رہے تھے۔ جب کہ حسرت کے مطابق شاعری کی روایت میں جدت تو دراصل ان اساتذہ نے کی جو ارسطو کے نظریۂ شعر یا قدیم یونانی نظریے کے مطابق مصوری اور شاعری میں واقعات محبت اور جذبات کی بعینہٖ ترجمانی کے برخلاف تصوراتی یا خیالی شاعری کر رہے تھے۔ حسرت نے تو بزعم خود اس جدت یا بدعت سے اپنی شاعری کے ذریعے روایت یا حقیقت کی طرف مراجعت کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اساتذہ کی زبان، روزمرے، محاورے اور ان کے اسلوب کی تو حسرت نے تقلید کی ہے لیکن ان کے پر تصنع مضامین، پیچیدہ خیالات اور غیر حقیقی عشق کے بیان سے احتراز کیا ہے۔ اب اس کا کیا کیجیے کہ عرب کے قصیدے سے براہ ایران آنے والی تشبیب، غزل کا قالب بدلنے کے باوجود قدیم اور روایتی ٹھہری، اور قدیم یونان سے انگریزی کے ذریعے آنے والا تصور شعر جدید کہلایا۔ اس حقیقت کا بطلان کیسے کریں گے کہ حسرت کی قدامت پرستی ان کے عہد کی مروجہ شاعری میں جدت پسندی کہلائی، اور ارسطو کے زمانے کی نقالی حسرت کے عہد کی حقیقت پسندی سے تعبیر کی گئی۔

دراصل ہمارے ناقدین نے فکشن کو تو سماج کا آئینہ سمجھا لیکن غزل کے تعلق سے وہ کبھی یہ ماننے کو تیار نہ ہوئے کہ غزل بھی سماج کی نوزائیدہ ہے۔ فکشن کے حوالے سے انھوں نے سماجی، اقتصادی اور سیاسی اثر پذیری اور عوام کی ترجمانی کو تو تسلیم کیا، لیکن غزل کی تنقید میں ہمیشہ انھوں نے روایت کو پیش نظر رکھا۔ جب کہ غزل بھی باطن کے علاوہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی اثرات سے محفوظ نہیں رہتی۔ خواہ قلی قطب شاہ کی غزل ہو یا میر و مومن کی، آتش و ناسخ کی غزل ہو یا داغ و حسرت کی یا ان کے بعد کی یا پھر آج کے شعرا کی۔ تمام غزلوں میں ان اثرات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ حسرت بھی اپنے عہد کی شاعری کر رہے تھے، انھیں یہ واقعیت پسندی اپنے دور اور اس کی اتھل پتھل سے حاصل ہوئی تھی، اور ان کی شاعری کا 'عشق' اور اس کے کردار بھی دراصل اپنے عہد اور اپنے ماحول کی پیداوار تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے قلی قطب شاہ،

میر وغالب، داغ وآتش، فیض وفراق اور تب سے لے کر آج تک کی شاعری میں عشق کا رنگ بدلتا بیان، اوران کی غزلوں کے روپ بدلتے کردار ظہور کرتے رہے ہیں۔ چاہیں تو پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، شہناز نبی اور فرحت احساس وغیرہ کی شاعری پر مزید ایک نظر ڈال لیں۔

ہمارے بیشتر ناقدین نے حسرت کی شاعری کے جس اہم پہلو کو نظر انداز کیا وہ ہے ان کے یہاں یاد کا استعمال۔ حسرت کی شاعری میں یاد ایک موٹف بن کر آیا ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ قید وبند کی زندگی یا تنہائی کی صعوبت ہو، محبوب کی قربت کے بعد کی دوری کا جان لیوا احساس ہو، ماضی کی بازآفرینی ہو، یا تصوف کے پردے میں پیرومرشد کا تصور ہو، خدا کا ذکر ہو، زمانے کی تبدیلی کا اظہار ہو یا پھر انسانی نفسیات کا انکشاف ہو، لیکن جس کثرت سے ان کے یہاں یاد کا لفظ آیا ہے اور یاد کی جو جو کیفیتیں بیان ہوئی ہیں وہ حیرت انگیز ہے۔ اس نوع کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے
غمِ دوراں نے کشاکش تو بہت کی لیکن
یاد ان کی دلِ حسرت سے بھلائی نہ گئی
یاد پھر اس بے وفا کی ہر گھڑی رہنے لگی
پھر اسی کا تذکرہ صبح و مسا ہونے لگا
شام ہو یا کہ سحر، یاد انھی کی رکھنی
دن ہو یا رات، ہمیں ذکر انھی کا کرنا
جہاں تک ہم ان کو بھلاتے رہے ہیں
وہ کچھ اور بھی یاد آتے رہے ہیں
مانوس ہو چلا تھا تسلی سے حالِ دل
پھر تو نے یاد آکے بدستور کر دیا
آئی جو ان کی یاد مرا دل ٹھہر گیا
دعویٰ غمِ فراق کا باطل ٹھہر گیا
ہم تری یاد کو بھولیں گے نہ بھولے ہیں کبھی
تو ہمیں بھول کے بھی یاد نہ کر شاد نہ کر
مدتیں ترکِ محبت کو ہوئیں پھر اے عجب
یاد یار آتی ہے کیوں بے اختیار اب کی برس
مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عیش کی
اب نظر کا ہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں

بھول بیٹھے تھے الٰہی کیا کریں اس دل کو ہم
ہجر میں پھر یاد جس دل نے دلائی آپ کی

حسرت کی شاعری سے متعلق آخری اور عجیب بات یہ کہ ان کی بیشتر غزلوں کے تمام اشعار یکساں ہیں۔ ایک ہی غزل کے اشعار میں رنگا رنگی، تنوع، اختلاف مضمون یا موضوع کی کثرت بالکل نہیں ہے۔ ان کی غزل کا پہلا شعر پوری غزل کے صرف موڈ یا کیفیت کا تعین نہیں کرتا بلکہ موضوع متعین کر دیتا ہے۔ جو بات یا جو کیفیت ان کی غزل کے پہلے شعر میں ہوتی ہے بقیہ اشعار میں اس کی تشریح، تفصیل، تصریح یا تجزیہ ہوتا ہے یا غزل کے پہلے شعر میں جو خیال بیان ہوا ہے بعد کے اشعار میں اس کی فضا بندی ہوتی ہے یا اس کی تکمیل کے مرحلے طے کیے جاتے ہیں۔ سو ان کی اس نوع کی غزلوں کو نظم یا غزل نما نظم کہہ لیں تو شاید ان کے ساتھ زیادتی نہ ہوگی۔ طرزِ گفتگو سے اندازہ یہ نہ لگائیے کہ یہ حسرت کی کمزوری ہے بلکہ اسے ان کی خوبی سمجھنا چاہیے، کہ انھوں نے تنہا غزل سے تمام اصناف شاعری کی خدمات لیں۔ ایک جینیس شاعر میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ پرانی ہیئت میں غیر محسوس تبدیلی کر سکے، اسے نیا لب ولہجہ اور تازہ آب ورنگ دے سکے، اسے نیا حسن و جمال بخشنے کے ہنر سے واقف ہو اور اس کے اسلوب کو اپنے خیالات سے ہم آہنگ کرنا جانتا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ حسرت ان چیزوں سے واقف تھے اور ان تمام چیزوں کو انھوں نے خوبصورتی سے برتا بھی ہے۔ انھوں نے جس موضوع یا خیال کو بیان کرنا چاہا ہیئت غزل کی ہی استعمال کی۔ وہ خود کہتے ہیں:

سوَیت آپ کا مقصد بغاوت آپ کا مسلک
مگر اس پر بھی حسرت کی غزل خوانی نہیں جاتی

کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہیے کہ حسرت نے غزل کو توانائی بخشی، اسے انسانی دنیا کے جانے پہچانے عاشق ومحبوب دیے، قابل قبول محبت کی داستان دی، عشق کا پاکیزہ تصور دیا، شگفتہ اسلوب دیا، زبان کی سادگی دی اور غزل کے احیا میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا لیکن حسرت کی غزلیہ شاعری اپنے آخری تجزیے میں تخلیقیت، خیال آرائی، حقیقت کے التباس، یا حقیقت اور تصور کے امتزاج کے بجائے آپ بیتی قرار پاتی ہے۔ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حسرت نے یا تو اپنی آپ بیتی کو شاعری کے قالب میں ڈھال دیا ہے، یا اپنی شاعری میں آپ بیتی بیان کی ہے۔ جی چاہے تو آپ اسے حسرت کی شاعری کا عیب جانیے اور چاہیں تو اسے حسرت کی شاعری کا امتیاز کہیے۔

□□□

پتہ:
Department of Urdu
Delhi University,
Delhi-110007

ارجمند آرا

بابا فرید شکر گنج کا پیغام

ہندوستان کی تاریخ میں ایسے لوگوں کے نام بکثرت مل جائیں گے جنھوں نے عالم انسانیت کے لیے خود کو وقف کیا، ایسے ناموں کی بھی کمی نہیں جنھوں نے اخلاقیات اور مذاہب کی دنیا میں کارہائے نمایاں انجام دیے، اور ایسے لوگوں کے نام بھی بہت ہیں جو علم و ادب کی دنیا کے چشم و چراغ ہیں۔ البتہ ایسی شخصیتیں بہت کم ہوں گی جن کے بارے میں یہ طے کرنا مشکل ہوگا کہ ہم انھیں مصلح کہیں، مذہبی رہنما کہیں یا ان کا شمار آسمان سخن کے روشن ستاروں میں کریں۔ اگر نظر ڈالیں تو کبیر اور نانک جیسے چند ہی لوگ ہیں جنھوں نے شاعری اپنے سماجی اور اخلاقی مقاصد کے حصول کے لیے کی اور اعلا درجے کا کلام بھی ہم تک پہنچایا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا مشرب صلح کل رہا، مذہب سے قطع نظر ایک آفاقی اخلاقی نظام کا قیام ان کا نصب العین رہا اور جن کا شمار پائے کے شعرا میں بھی ہوتا ہے۔ بابا فرید، کبیر اور نانک اسی روایت کے امین ہیں۔ صوفی بزرگ کے طور پر انھوں نے دنیا سے خود کو ایک فاصلے پر رکھا، کنارہ کشی اختیار کی لیکن ساتھ ہی خود کو عالمِ انسانیت کے لیے وقف بھی کر دیا۔ ان کے جو سوانحی حالات ہم تک پہنچے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے تقوے اور پرہیز گاری کی زندگی عوام کے درمیان رہ کر گزاری جس سے متاثر ہو ہو کر لوگ ان کے معتقد ہوتے جاتے تھے اور اس طرح ان کی مقبولیت اور شہرت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ ان کی شاعری میں جو اخلاقی درس اور سادہ زندگی کا فلسفہ ملتا ہے، وہ نیک دل لوگوں کو ضرور متاثر کرتا ہے۔

اگر ہم بابا فرید کے عہد پر نظر ڈالیں تو بارھویں صدی کا یہ وہ عہد ہے جسے تاریخ کی اصطلاح میں عموماً عبوری دور کہا جاتا ہے۔ سیاسی اعتبار سے یہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا عہد ہے جن میں سے ہر ایک مستقل بالذات مرکز کی حیثیت رکھتی تھی۔ کوئی ایسا مضبوط مرکزی نظام حکومت نہ تھا جیسا قدیم عہد میں اشوک جیسے طاقتور حاکموں نے دیا تھا۔ سیاسی وحدت اور واضح قومیت کے جذبے کے فقدان کے باوجود سماجی اور مذہبی اصلاح کی تحریکات کے نقطۂ نظر سے یہ دور بہت اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ اسی دور میں ہندوستان میں تصوف کو فروغ حاصل ہوا۔ ایران، ترکستان اور خطۂ عرب سے حکمراں طبقے کے ساتھ ساتھ بہت سے علما، مشائخ، اور صوفی بزرگوں نے بھی ہندستان کا رخ کیا اور اس کو اپنا مستقل مسکن بنایا۔ ان کے توسط سے مختلف قوموں، ملکوں اور مذہبوں کے باہمی ربط، جذب و قبول اور امتزاج کا عمل شروع ہوا۔ ان حالات میں ہندستان کا کشمیری اور مذہبی معاشرہ تصوف کے لیے زرخیز زمین ثابت ہوا۔ تصوف اور بھکتی کے امتزاج سے صلح کل، وسیع المشربی اور انسان دوستی کے جس تصور کو فروغ حاصل ہوا وہ عالمی انسانی برادری کے لیے مشعل راہ ہے۔ بابا فرید اسی دور کی عطا ہیں اور اسی روایت کے امین ہیں۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں، بابا فرید سلسلۂ چشتیہ کے معروف بزرگ ہیں۔ وہ بارھویں صدی کے ربع آخر میں (غالباً 1173 میں) موضع کھتوال، ضلع ملتان میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ حضرت عمر بن خطاب سے ملتا ہے۔ ماں باپ نے ان کا نام مسعود رکھا تھا، فریدالدین لقب ہے اور عرف عام میں حضرت بابا فرید شکر گنج کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ان کی شادی سلطان ناصرالدین محمود کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ خود ان کے دادا شیخ شعیب، سلطان محمود غزنوی کے بھتیجے تھے۔ ان کا خاندان سلطان شہاب الدین غوری کے عہد میں پنجاب میں آ کر آباد ہوا تھا۔ بابا فرید خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ بابا فرید نے 7 مئی 1266 کو پاک پٹن میں وصال کیا جہاں ان کے شاگرد اور خلیفہ خواجہ نظام الدین اولیا نے ان کا مزار بنوایا۔ ہزاروں معتقدین ان کے عرس کے موقعے پر ان کے مزار کی زیارت کو آتے ہیں۔ یہ عرس ہر سال محرم کی پانچ، چھ اور سات تاریخ کو ہوتا ہے۔

بابا فرید کو پنجابی کا پہلا معروف و مستند شاعر سمجھا جاتا ہے۔ ان کے بعد تقریباً تین صدیوں تک خلا ہے اور کوئی اہم نام پنجابی شاعری کے افق پر نہیں ابھرتا۔ اسی لیے صوفی اور شاعر کے طور پر ان کی حیثیت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ گرو ارجن دیو نے گرو نانک صاحب کے صحیفے ''گرو گرنتھ صاحب'' کو ترتیب دیتے وقت اس میں بابا فرید کی 130 ابیات بھی شامل کر لی تھیں جس سے ان کا کم از کم تھوڑا سا کلام محفوظ ہو گیا۔ ''گرو گرنتھ صاحب'' میں شامل کلام کے علاوہ ان کا بہت کم کلام ملتا ہے لیکن محققین اور اسکالرز کا اندازہ ہے کہ انھوں نے فارسی، اردو اور پنجابی میں بھی اشعار کہے ہوں گے۔ بہرحال ان کا جتنا کلام بھی مہیا ہے اس سے یہ اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کو، بلکہ شاعری کی ایک مخصوص صنف 'دوہے' کو انسان دوستی اور مذہب کا پیغام پھیلانے کے لیے استعمال کیا۔ انھوں نے اپنے حسن اخلاق، پرہیز گاری کی طرز زندگی، عمل صالح اور ذوق شعر، غرض اپنی زندگی کے ہر پہلو سے مبلغ اخلاق کا کام لیا اور عوام کے ایک بڑے حلقے کو متاثر کیا۔

اس مختصر سے جائزے میں ان کے حسنِ اخلاق اور خدمات کی تفصیلات کا بیان ممکن نہیں، اس لیے یہاں ان کی اہم تعلیمات کا جائزہ ان کے دوہوں کی روشنی میں لیا جائے گا۔

•

ہندوستان کو عدم تشدد کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ ہزاروں سال پہلے گوتم بدھ نے اس سرزمین پر انسان کی محبت کے نغمے گائے، برابری کا پیغام دیا، رحم دلی کو بنیادی اہمیت دی اور عدم تشدد کی تبلیغ کی۔ ہر دور کے صوفی سنتوں نے اسی پیغام کو ملک کے کونے کونے میں عام کیا ہے۔ آج کے دور میں جب ہم اہنسا کی بات کرتے ہیں تو گاندھی جی کا نام لیتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ گاندھی جی نے تو صرف گوتم، نانک اور بابا فرید کی روایت کو ہی آگے بڑھایا ہے:

جوئیں مارن مُکیاں تِنھاں نہ ماریں گھُم
آپنے گھر جائیے پیر تِنھاں دے چُم

یعنی، اگر کوئی شخص تم کو گھونسا مارے تو تم پلٹ کر اسے نہ مارو بلکہ ان کے پاؤں چوم کر اپنے گھر چلے جاؤ۔ معاف کرنے اور نفس پر قابو پانے کی یہ تلقین ہمیں حضرت عیسیٰ کی اس تعلیم کی یاد دلا دیتی ہے کہ اگر کوئی تمھارے گال پر ایک تھپڑ مارے تو تم دوسرا گال بھی اس کے آگے کر دو۔ آج کے دور میں بظاہر اس قسم کی تعلیمات کی کوئی اہمیت نہیں سمجھی جاتی لیکن اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ باتیں دل کو لگتی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر لوگ صدق دل سے ان تعلیمات کو مانیں تو یہ دنیا رہنے کے لیے ایک بہتر مقام ہو جائے۔

بابا فرید دوسروں کی عیب جوئی کو بھی دل آزاری کا باعث سمجھتے تھے جو تشدد ہی کا ایک اور روپ ہے۔ اسی لیے دوسروں کی عیب بینی کے بجائے وہ انسان سے اپنے گریبان میں جھانکنے کو کہتے ہیں:

جے توں عقل لطیف، کالے لکھ نہ لیکھ
آپنے گریوان میں سر نیواں کر دیکھ

بابا فرید نے جس قسم کی زندگی کو اپنا نصب العین بنایا، اسی کی تبلیغ بھی اپنی شاعری کے ذریعے کی۔ انھوں نے انسان سے محبت کرنے کا پیغام بھی دیا لیکن عالم انسانیت کی محبت اور خدمت کو دراصل اپنے اصل محبوب یعنی خدا کی قربت اور وصل کا ذریعہ مانا۔ ان کے نزدیک انسان کی زندگی کا پہلا مقصد اپنے محبوب کا قرب حاصل کرنا ہی ہے جس کے لیے دنیا کے عیش و عشرت اور محبت کو ترک کرنا لازمی ہے۔ اس فلسفۂ زندگی میں دنیا کے فانی ہونے، ایک سراب اور مایا جال ہونے کا شدید احساس پایا جاتا ہے جس سے انسان کو دھوکا نہ کھانا چاہیے، اس سے دور رہنا چاہیے، مبادا وہ اپنا مقصدِ زندگی فراموش کر بیٹھے۔ وہ ایک دوہے میں کہتے ہیں کہ دنیا ایک ایسی آگ کی مانند ہے جس میں گھر کر کچھ نہیں سوجھتا، عقل کام نہیں کرتی۔ اگر میرا مالک مجھے عقل سلیم عطا نہیں کرتا، مجھے درست نہ رکھتا تو میں بھی اس آگ میں جل جاتا:

کجھ نہ بجھے، کجھ نہ سجھے، دنیا گجھی بھاہ
سائیں میرے چنگا کیتا، نہیں تاں ہنبھی دجھاں ہا

محبوب کے وصال کے لیے تقویٰ اور پرہیزگاری لازمی جز ہیں۔ یہ اوصاف عاجزی، انکساری اور خود احتسابی کے ذریعے پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ اسی لیے ایک جگہ کہتے ہیں کہ اگر میں یہ جانتا کہ میرا دامن بوسیدہ ہے تو میں اس میں مضبوط گرہ لگاتا۔ میں نے ساری دنیا کو دیکھ لیا، اور پایا کہ مجھ سے زیادہ برا کوئی دوسرا نہیں ہے:

جے جاناں لڑ چھجنا پیڑھی پائیں گنڈھ
تیں جے وڈ میں نہ کو، سبھ جگ ڈٹھا ہنڈھ

تقویٰ اور پرہیزگاری کی دوسری لازمی شرط دنیا کے عیش و آرام کو تیاگنا اور اس کی الفت اور لالچ کو ترک کرنا ہے۔ اس میں مشکلات ہیں لیکن ان سے بے نیاز ہو کر ہی اپنے مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے:

رُکھی سکھی کھاء کے ٹھنڈا پانی پی
دیکھ پرائی چوپڑی نہ ترسائیں جی

جن لوگوں کے دلوں میں عیش دنیا اور لالچ جیسی برائیاں جڑ پکڑ لیتی ہیں وہ شیطان کی آماجگاہ بن جاتے ہیں۔ پھر آپ لاکھ چلائیں، شور کریں، نصیحتیں کریں لیکن ایسے دلوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا:

کوکیندیاں، چاکیندیاں، متیں دیندیاں نت
جو شیطان ونجایا سے کِت پھیرے چِت

صوفی مسلک اور نرگن پنتھ کے پریم مارگی شاعروں نے اپنے محبوب کو مذکر اور عاشق کو اس کی جوگن اور دیوانی کے روپ میں مؤنث باندھا ہے۔ اس علامت نے جس طرح کی کیفیت اور ماحول کو جنم دیا ہے اس کے سبب ان کی شاعری فارسی سے یا روایتی طرز سے بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ اس میں نسائی طرز اظہار کے سبب جذبات کی نرمی، لہجے کا دھیماپن، محبت کی شدت اور مر مٹ جانے کا جذبہ ایک الگ ہی شعری دنیا کی تخلیق کرتے ہیں۔ یہ شاعری ہماری توجہ ہندوستان کی اس مثالی عورت کی طرف مبذول کراتی ہے جو مہر و وفا کا پیکر ہے، اپنے شوہر کو بجائے خدا سمجھتی ہے اور اس کی خوشنودی کو مقصدِ حیات۔ صوفی شاعروں نے اس عورت کو عاشق سے استعارہ کر کے ایک بالکل ہی جداگانہ روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس کی مثالیں ہندوستان کی ہر زبان کی شاعری میں مل جائیں گی، خصوصاً برج، اودھی، پنجابی، کھڑی بولی اور مراٹھی میں۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ بابا فرید نے بھی اسی روایت کو آگے بڑھایا

ہے۔ ایک مثال سے یہاں وضاحت ہوجائے گی:

گلیاں چکڑ، دور گھر، نال پیارے نینہہ
چلاں تاں بھجے کملی، رہاں تاں ٹٹے نیہہ
بھجو سجو کملی، اللہ ورسو مینہہ!
جاء ملاں تیہاں سجناں، تٹو ناہیں نینہہ

یعنی، گلیوں میں کیچڑ بھری ہے، محبوب کا گھر دور ہے، اس سے ملنے کیسے جاؤں۔ کیا کروں، چلوں تو کملی بھیگتی ہے، رکوں تو پیار ٹوٹتا ہے۔ اب کملی بھیگ جائے، چاہے گیلی ہوجائے، اور کتنا ہی پانی برسے، میں اپنے محبوب سے جا کر مل ہی لوں گی؛ اور یوں میرا پیار ٹوٹنے سے بچ جائے گا۔

مشکلات پر قابو پانے، ان کو نظر انداز کرکے اپنے مقصد حیات پر نظر رکھنے کا کام وہی کرسکتا ہے جو زندگی کے صحیح معنی سمجھتا ہو، اس کی حقیقت کو جانتا ہو۔ بابا فرید کے نزدیک یہ حقیقت ہے دنیا کا عارضی اور فانی ہونا۔ دنیا تو ہمارے لیے وسیلہ ہے اس دائمی زندگی میں کامیابی کا جس کے حصول کے لیے ہمیں اس دنیا میں فقر و استغنا اور پرہیزگاری کی بے لوث زندگی گزارنی ہے۔ دنیا فانی ہے، ہمارا جسم فانی ہے اور اس مٹی کو مٹی میں مل جانا ہے۔ یہ صوفی مسلک کا فلسفہ ہے، ایسی حقیقت ہے جسے سب تسلیم کرتے ہیں، اور ہمارے شعرا نے بھی اس کا بیان اپنے اپنے انداز میں موثر ڈھنگ سے کیا ہے۔ بابا فرید دنیا کے فانی ہونے اور مٹی کے تلازمے کو زندگی کے دوسرے حقائق پر بھی منطبق کرتے ہیں۔ وہ اس میں مغرور لوگوں کے لیے عبرت کا مقام دیکھ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس مٹی کی ہم ذرا بھی قدر نہیں کرتے، بلکہ اسے حقیر جانتے ہیں، اس پر اترا کر چلتے ہیں اور اس کو روندتے ہیں، کل ہم اسی مٹی کے نیچے ہوں گے اور وہ ہمیں روندے گی:

فریدا خاک نہ نندیے! خاکو جیڈ نہ کوہ
جیوندیاں پیراں تلے، موریاں اُپر ہوء

مٹی ہی کو استعارہ بنا کر بابا فرید ایک اور پیغام یہ دیتے ہیں کہ غافل انسان اس وہم میں رہتا ہے کہ اس کی دستار میلی نہ ہوجائے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ دستار تو دستار، ایک دن اس کا سر بھی مٹی کھائے گا، خاک میں مل جائے گا:

میں بھلاوا پگ دا مت میلی ہو جاء
گہلا روح نہ جان ای سر بھی مٹی کھاء

یہی بابا فرید کے نزدیک زندگی کا فلسفہ ہے۔ ان کی شاعری اسی طرح کے فکر انگیز خیالات سے معمور ہے۔ ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو بابا فرید اور ان کے مسلک کے دوسرے شعرا دراصل ادب میں اسی روایت کے بنیاد گزار ہیں جنھوں نے شاعری برائے مقصد کو اپنا نصب العین بنایا۔

□□□

(نوٹ: اس مضمون میں بابا فرید کا کلام
http://www.apnaorg.com/peotry/farid/farid2.html
سے نقل کیا گیا ہے۔ سوانحی حالات کے لیے
http://en.wikipedia.org/wiki/Bhagat_Farid
سے استفادہ کیا گیا ہے۔)

پتہ:
5/3, University Road,
University of Delhi,
Delhi-7

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔ پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرّہ کی زندگی رسم و رواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415

قیمت: -/216 روپئے

رفعت سروش

وِدِودھ بھارتی کے معمار گوپال داس جی کی یاد میں

آل انڈیا ریڈیو کے تاج محل کے آخری معمار کا بھی انتقال ہوگیا۔ وِودھ بھارتی کو مقبولیت کی بلندیوں پر پہنچانے والے گوپال داس جی نے 89 سال کی عمر میں اپنے آبائی شہر جے پور میں آخری سانس لی اور اس طرح اس عظیم ادارے کے انتظامی ڈھانچے کو پختہ تر کرنے والا آخری آدمی بھی تاریخ بن گیا۔

آل انڈیا ریڈیو کو ''تاج محل'' اگرچہ میں نے اس سے اپنے جذباتی لگاؤ کے باعث کہا ہے، مگر امرِ واقعہ ہے کہ جب 1936 کے طلوع ہونے کے ساتھ علی پور روڈ (دہلی) میں اس کا قیام عمل میں آیا تو گویا اپنے دور کا ایک عجوبہ وجود میں آیا جس نے ادب و شعر اور علم و ثقافت کی دنیا میں ایک ہلچل مچا دی اور انسانی آواز کو صحیح معنوں میں ''فلک پیما'' کر دیا۔ تصور کیجیے کہ جب آسمان کے ستاروں نے زمینِ ہند کے فرزندوں اور دختروں کی آوازیں سنی ہوں گی تو ان کو کیا محسوس ہوا ہوگا۔

آل انڈیا ریڈیو نے اپنے نام کے ساتھ ہی اردو ہندی کے تنازعے کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اردو ہندی سیکشنوں کے بجائے اردو ہندی زبانوں کے پروگراموں کے سیکشن کا نام ''ہندوستانی سیکشن'' رکھا۔ آل انڈیا ریڈیو سے ہندوستانی میں ہی خبریں نشر ہوتی تھیں نہ کہ اردو یا ہندی میں۔ سننے والے کو اس سے غرض نہیں کہ نشر کرنے والا دیوناگری اسکرپٹ سے پڑھ رہا ہے یا اردو اسکرپٹ سے۔ اسے تو سننے سے مطلب ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کے پہلے ڈائرکٹر جنرل احمد شاہ پطرس بخاری مقرر کیے گئے جو تقسیمِ ہند کے چند ماہ قبل تک اس عہدے پر متمکن رہے۔ 1947 تک آل انڈیا ریڈیو کے چند ہی مرکز تھے پشاور، لاہور، دہلی، لکھنؤ، بمبئی، کلکتہ، مدراس اور ترچناپلی۔ ہندوستانی نشریات کے مراکز صرف پانچ تھے پشاور، لاہور، دہلی، لکھنؤ اور بمبئی۔ (اور بمبئی سے ہی گجراتی، مراٹھی اور کونکنی پروگرام نشر ہوتے تھے۔ انگریزی تو خیر ہر جگہ سے نشر ہوتی ہی تھی)

آزادی سے قبل اردو ہندی کے جو ادیب اور شاعر آل انڈیا ریڈیو سے بسلسلۂ ملازمت منسلک ہوئے ان میں کئی ایسے اہم نام ہیں جن کے ذکر کے بغیر بیسویں صدی کے ادب کا منظر نامہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ چیتن آنند، کرشن چندر، منٹو، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، ن۔م۔ راشد، میراجی، مختار صدیقی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، لالہ مہیشور دیال، بہزاد لکھنوی، سلام مچھلی شہری، اختر الایمان، شوکت تھانوی، مجاز، پریم ناتھ در، گرجا کمار ماتھر، وشوامتر عادل، عشرت رحمانی، فضل حسین قریشی، اخلاق احمد، حفیظ ہوشیار پوری، آغا اشرف، اعجاز بٹالوی، بلراج ساہنی، راز مرادآبادی، حبیب تنویر، آلِ عبا آوارہ، شاہد بدایونی اور راقم الحروف رفعت سروش۔ کچھ نام اور بھی ہوسکتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے ادیب اور شاعر تقسیمِ وطن سے پہلے ہی ریڈیو چھوڑ گئے تھے اور تقسیم کے بعد بہت سے پاکستان چلے گئے۔

اس وقت ان ادیبوں اور شاعروں کی کارگزاریوں کا ذکر مقصود نہیں ہے اس کے لیے ایک ضخیم مضمون کی ضرورت ہے۔ میں گوپال داس جی کے حوالے سے ان لوگوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو آل انڈیا ریڈیو کے تنظیمی ڈھانچے کے ذمے دار تھے۔ آزادی سے پہلے جن اسٹیشن ڈائرکٹروں میں سیٹھنا، رشید احمد، سیّد ذوالفقار بخاری، کے۔ایس۔ ملک، لکشمانند، سومناتھ چپ، وکٹر پران جوتی، کرشنا مینن اور کھرجی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

یہ اسٹیشن ڈائرکٹر صرف اچھے منتظم ہی نہیں تھے، بلکہ اچھے براڈکاسٹر بھی تھے۔ ڈائرکٹر جنرل پطرس بخاری تو ایک ہی کتاب لکھ کر لازوال شہرت کے مالک بن گئے۔ ''مضامینِ پطرس''۔ ذوالفقار بخاری غضب کے براڈکاسٹر تھے۔ ان کی آواز کے جادو اور ڈرامائی جینیس کا ذکر میں نے اپنے دیگر مضامین میں کیا ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کے شاعر تھے اور ان کی خودنوشت ''سرگزشت'' تو اپنے دور کی اہم تاریخ کا درجہ رکھتی ہے۔ کے۔ایس۔ ملک ''جھلکیاں'' لکھنے کے ماہر تھے۔ ہلکے پھلکے طنزیہ ڈراموں پر مشتمل ورائٹی پروگرام ''جھلکیاں'' وہ خود ہی پروڈیوس کرتے تھے۔ جب تک ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ہوکر دہلی کی ''افسر شاہی'' کے رکن نہیں بن گئے۔ 1958 تک ممبئی میں بھی ان کے پروڈکشنوں کا سلسلہ جاری رہا۔ دہلی کے اسٹیشن ڈائرکٹر رشید احمد سے مجھے ایک بار اپنے ''اردو مجلس'' کی پروڈیوسری کے زمانے میں ملنے اور ان کا انٹرویو ریکارڈ کرنے کا موقع میسر آیا (وہ پاکستان سے آئے تھے) تو معلوم ہوا کہ وہ تحت اللفظ اشعار پڑھنے کے ماہر تھے اور بڑے ڈرامائی انداز میں شعر کی روح کو اپنی آواز میں کھینچ لاتے تھے۔ دراصل انتظامی صلاحیت اور افسرانہ شان کے ساتھ فنِ نشریات سے عملی مناسبت بھی ان بزرگانِ ریڈیو کی خصوصیت تھی اور اس روایت کو جن لوگوں نے آزادی کے بعد کچھ عرصے تک جاری رکھا ان میں وہ لوگ شامل ہیں جو تقسیم

کے وقت اسٹیشن ڈائرکٹر کے درجے سے کم مرتبہ افسران تھے۔ ان حضرات میں سے جو لوگ تقسیم کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں اسٹیشن ڈائرکٹر یا اس سے اونچے درجے تک پہنچے ان میں میری معلومات کے مطابق درج ذیل افسران ہیں (دیگر افسران بھی مدراس، کلکتہ اور تری وندرم میں ہو سکتے ہیں) بہرحال جن لوگوں نے سابقہ روایات کی توسیع کی ان میں ڈاکٹر رام مراٹھے، بی. ایس. مرڈھیکر، سی.بی مہتہ، مہراسانی، اقبال سنگھ، گرجا کمار ماتھر، اقبال ملک، ایم. جی. ویدیا، گجو بھائی ویاس، ہنس راج لوتھر اور گوپال داس جی کے نام ہیں۔ اب اس قبیل کے تمام زعمائے آل انڈیا ریڈیو ملکِ عدم سدھار گئے۔ گوپال داس جی اس سلسلے کی آخری کڑی تھے۔

گوپال داس جی سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب وودھ بھارتی یونٹ بمبئی سے دہلی منتقل ہوا۔ یہ ستمبر 1958 کی بات ہے۔ وودھ بھارتی کی تاریخ بھی بہت دلچسپ ہے۔ کچھ تو ڈاکٹر بی.وی کیسکر نے انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ منسٹر کی حیثیت سے کچھ نام نہاد اصلاحات کیں اور فلمی گانوں کی نشریات کو تقریباً بین کر دیا، بڑے سے بڑے کلاسیکل گانے والوں اور سازندوں کے لیے بھی اوڈیشن میں کامیاب ہونا ضروری قرار دے دیا۔ (صرف روی شنکر ستار نواز اور علی اکبر خاں سرود نواز کو مستثنیٰ قرار دیا اور احتجاج کے طور پر مشہور ستار نواز ولایت خاں نے اوڈیشن دینے سے انکار کر دیا اور خود ہی آل انڈیا ریڈیو کا بائیکاٹ کر دیا) پکے گانوں کی بھرمار کے باعث آل انڈیا ریڈیو کے سننے والوں کی تعداد گھٹتی چلی گئی۔ اس پر مستزاد ریڈیو سیلون کے دیا پار وبھاگ کے پروگرام۔ ریڈیو سیلون نے تو وہ مقبولیت حاصل کی کہ خدا کی پناہ۔ بمبئی اسٹیشن کے اناؤنسر وجے کرشن دوبے بھی کولمبو پہنچ گئے اور امین سیانی، ایاز پیر بھائی، بال گووند سریواستو اور تقی رضوی وغیرہ نے بمبئی سے ہی پروگرام ریکارڈ کر کے ریڈیو سیلون کولمبو کو بھیجنے شروع کر دیے۔ ریڈیو سیلون کے پروگراموں میں فلمی گانوں کی بہتات ہوتی تھی یا چٹکلے اور لطیفے۔

ایسے میں آل انڈیا ریڈیو کے اربابِ حل وعقد کو فکر دامن گیر ہوئی کہ آخر اس غیر مقبولیت کا مداوا کیا ہو۔ ڈائرکٹر جنرل جے. بی. ماتھر نے کچھ ہندی، اردو اور دیگر زبانوں کے مشاہیر کو آل انڈیا ریڈیو میں پروڈیوسروں کے طور پر ملازم رکھا تھا اور ایسے اہم لوگوں میں ہندی کے ادیب و شاعر سمترا نندن پنت، ڈاکٹر رام کمار ورما، ہری ونش رائے بچن، الاچند جوشی، بابو بھگوتی چرن ورما، اُدے شنکر بھٹ، نریندر شرما اور بھوانی پرساد مشر جیسے نامی گرامی لوگ تھے۔ اردو میں روش صدیقی اور ساغر نظامی کو بھی اسی سلسلے میں ملازم رکھا گیا تھا۔ نریندر شرما ایک بڑے شاعر تو تھے ہی ریڈیو پروگرام کے سلسلے میں بھی سوجھ بوجھ کے آدمی تھے، اور ایک عرصے سے فلمی گانے اور اسکرپٹ لکھتے رہے تھے۔ آگے چل کر مہابھارت جیسے سیریل کی کہانی بھی انھی کے زورِ قلم کا نتیجہ تھی۔ نریندر شرما سے جے.بی. ماتھر نے مشورہ کیا اور طے پایا کہ ایک آل انڈیا ورائٹی پروگرام شروع کیا جائے جس میں ہلکے پھلکے گانے، مختصر ڈرامے، خاکے اور لطائف وظرائف ہوں مگر آل انڈیا ریڈیو کے اس طرح کے پروگرام کے لیے فنڈ کا فقدان تھا۔ چنانچہ طے کیا گیا کہ آل انڈیا ریڈیو کے تمام اسٹیشن اپنے اپنے منتخب پروگرام Off Broadcast ریکارڈ کر کے بھیجیں، جن میں صرف ریکارڈنگ کا خرچ ہو۔ اس یونٹ کا قیام بمبئی اسٹیشن پر عمل میں آیا اور ادھر ادھر سے تبادلے کر کے اور ان میں سے کچھ لوگوں کو ترقی دے کر وودھ بھارتی یونٹ قائم کر دیا گیا۔ پنڈت نریندر شرما چیف پروڈیوسر، ایس.ایس.ایس. ٹھاکر ڈراما پروڈیوسر، اور ستیندر شرت، بی.ایس بھٹناگر، بھرنگ تپکری اور راقم الحروف رفعت سروش۔ چاروں اسسٹنٹ پروڈیوسر بنا دیے گئے۔ (ہم سب پہلے سے ہی اسٹاف میں تھے) دوسرے اسٹیشنوں سے نشر شدہ پروگراموں میں سے ہم لوگوں نے کاٹ چھانٹ کر کے وودھ بھارتی کے لیے مواد اکٹھا کیا اور اس میں کچھ مرچ مصالحہ ملا کر دلچسپ پروگرام بنانے شروع کیے، جن کی تفصیل قلم بند کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ پانچ چھ مہینے پروگراموں کی تیاری میں لگے۔ آخر کار آٹھ نو گھنٹے روزانہ کے پروگراموں کے ٹیپ تیار ہو گئے اور یہ اہتمام کر لیا گیا کہ ان پروگراموں کی پہنچ ہندوستان کے کونے کونے میں ہو۔ کے.ایس. ملک ہمارے اسٹیشن ڈائرکٹر تھے اور اقبال ملک اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر اور جب ایک سال تک یہ پروگرام تجرباتی طور پر مقبول ہو گیا اور ہر طرف وودھ بھارتی کا ڈنکا بجنے لگا تو طے ہوا کہ اب اس یونٹ کو دہلی منتقل کر دیا جائے اور اس منتقلی نے مجھے بھی بمبئی سے ''اُکھاڑ دیا'' ورنہ میں بمبئی کو ہی اپنا وطنِ ثانی سمجھنے لگا تھا۔ بمبئی کی زندگی اور نو بہ نو تجربات نے میرے قلم پر دھار رکھی۔ بمبئی میں ہی میں آل انڈیا ریڈیو جیسے ادارے سے وابستہ ہوا اور ایک جگہ جم کر ملازمت کرنے کا ارادہ کیا ورنہ اس سے قبل میں تقریباً نصف درجن سرکاری اور غیر سرکاری نوکریاں چھوڑ چکا تھا۔ بمبئی نے ہی میرے فکر وفن پر شہرت کے پر لگائے۔ بمبئی کی سماجی زندگی اور معاشرت سے میں اس قدر گھل مل گیا کہ جب وودھ بھارتی کے ساتھ میں نے اپنا رختِ سفر دہلی کے لیے باندھا تو خود مجھے بھی یقین نہیں تھا کہ میں ہمیشہ کے لیے بمبئی کی رہائش کو خیر باد کہہ رہا ہوں۔ بہرحال یہ الگ کہانی ہے۔

یکم ستمبر 1958 کو میں نے دہلی کے وودھ بھارتی یونٹ میں قدم رکھا۔ بمبئی سے یونٹ کے جو اہم لوگ دہلی آئے ان میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر اقبال ملک، پروگرام ایگزیکیٹیو منظور الامین اور ہم تین اسسٹنٹ پروڈیوسر بی.ایس.

بھٹناگر، ستیندر شرت اور راقم الحروف رفعت سروش۔ بمبئی میں ہمارا دفتر ورلی میں ٹرانس میشن کے ساتھ ہی دو کمروں اور ایک اسٹوڈیو پر مشتمل تھا اور گویا ''جنگی پیانے'' پر ہم نے وہاں کام کیا تھا مگر یہاں آکر تو وودھ بھارتی کو ایک ''تشخص'' مل گیا تھا۔ ایک بہت بڑا دفتر اور بہت ہی عمدہ اور جدید سہولیات سے آراستہ کئی اسٹوڈیو۔ ہر اسٹوڈیو میں ریکارڈنگ کے لیے انجینئر موجود (بمبئی میں ہم لوگ خود ہی ریکارڈنگ کرتے تھے)۔ بمبئی میں ہم نے ڈیڑھ سال میں بڑے جتن سے ٹیپوں کا ذخیرہ جمع کیا تھا مگر یونٹ کو منتقل کرتے وقت ان ٹیپوں کو تقریباً ردی کے ڈبوں کی طرح کمروں میں ڈال دیا گیا۔ اب ہم کام کیسے کریں گے، یہی ٹیپ تو ہماری کل کائنات ہیں مگر واہ رے وودھ بھارتی کے ڈائرکٹر گوپال داس جی کا حسنِ انتظام! انھوں نے چند روز ہی میں یونٹ کی کایا بدل دی۔ ٹیپ بہت سلیقے سے الماریوں میں سجا دیے گئے۔ ان کے کیوشیٹ تیار کیے گئے اور نہ صرف جے پور، الہ آباد اور دہلی اسٹیشنوں سے تجربہ کار اناؤنسروں کا تبادلہ وودھ بھارتی میں کرایا بلکہ نئے اناؤنسر بھی ملازم رکھے۔ ہر چیز میں ذاتی طور پر دلچسپی لیتے تھے۔ اسٹاف کے ہر آدمی کے مسائل سے واقف، ہر آدمی کے کام کی صلاحیت اور کمزوریوں سے واقف۔ درمیانہ قد و قامت کے آدمی۔ ہمیشہ عمدہ سوٹ میں ملبوس، چہرہ پر سکون اور خود اعتمادی سے بھرپور۔ غصہ یا ناگواری ان کے چہرے سے ظاہر ہی نہ ہوتی تھی اور اونچی آواز میں تو وہ بات ہی نہیں کرتے تھے۔ ایک دبی دبی سی ذہین سی مسکراہٹ ان کی خوشی اور طمانیت کا اظہار کرتی تھی۔ ان کا دفتر دوسری بلڈنگ میں تھا، مگر روز بلاناغہ پروگرام میٹنگ میں آتے اور اپنے انداز سے نشر شدہ پروگراموں پر تبصرہ کرتے، جس میں لفظ کم ہوتے اور چہرے کے اتار چڑھاؤ زیادہ۔ ذوالفقار بخاری کے بعد جس اسٹیشن ڈائرکٹر نے مجھے متاثر کیا وہ گوپال داس جی تھے یا ان کے بہت عرصے بعد میں پریم ناتھ ڈر کی شخصیت اور ان کے کام کرنے کے انداز سے متاثر ہوا اور نہ بڑے بڑے ''خود پسندوں'' کو جھیلا۔

گوپال داس جی کے زمانے میں وودھ بھارتی میں کام کرنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ مجھے کئی پروگرام دے دیے۔ یہاں تک کہ میں نے ان کی خوشنودی کے لیے خطوں کے جواب کا ہفتہ وار منظوم اسکرپٹ لکھنا شروع کیا۔ فلمی گانوں پر مبنی گیتوں پر کئی کہانیاں منظوم لکھیں۔ ان کی تبسم سے بھری داد یہ سب کچھ کراتی تھی کہ یہ شخص کام کی قدر کرنا جانتا تھا۔ کئی اور لوگوں کی بہ نسبت مجھے زیادہ کام سے لاد دیا۔ میں نے دبی دبی زبان سے شکایت کی تو بولے۔ ''رفعت! آدمی کو اس کی Capacity کے حساب سے کام دیا جاتا ہے۔'' تنخواہ بڑھانے کا وقت آیا تو خاصا اضافہ کیا اور مجھے بلا کر کہا:

''رفعت! مجھے افسوس ہے کہ میں اس سے زیادہ اضافہ نہیں کرسکتا۔ تم اس سے بھی زیادہ کے حقدار ہو۔''

میرا دل کھل اٹھا اور میں نے کہا: ''آپ نے یہ فرما کر مجھے سب کچھ دے دیا۔''

گوپال داس جی کے کردار کی عظمت کا ایک واقعہ میں کبھی نہیں بھولتا۔ 1960 کے آس پاس کی بات ہے، میں ملبھاران میں رہتا تھا۔ اکثر ریگل تک پیدل آجاتا تھا اور وہاں سے ریڈیو اسٹیشن کے لیے بس پکڑتا تھا۔ گرمی کا زمانہ، ہفتے کا دوسرا سنیچر۔ چھٹی کا دن۔ میں دوپہر کو گھر سے کھانا کھانے کے بعد دفتر کے لیے نکلا۔ کوئی ضروری ریکارڈنگ کرنا تھی۔ ریگل سے ایک بس میں چڑھا۔ وہاں ایک سیٹ پر بیٹھنے کے لیے ایک سفید کھدر پوش سے تو تو میں میں ہوگئی۔ نہ میں اس سے واقف تھا نہ وہ مجھ سے۔ میں ریڈیو اسٹیشن اترا، وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آیا اور کچھ لوگوں سے میرا نام وغیرہ معلوم کرکے چلا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایک ممبر پارلیمنٹ تھا۔ اس شخص نے آدھے گھنٹے کے اندر اندر ایک شکایت ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل جے.بی. ماتھر (آئی سی ایس) کو درج کرادی کہ آپ کے ایک پروڈیوسر رفعت سروش نے مجھے بس میں گالیاں دیں اور مکوں سے مارا (جو سراسر غلط تھا) اور جے.بی. ماتھر کا اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک نوٹ گوپال داس جی کے نام وودھ بھارتی کے ڈیوٹی روم میں پہنچ گیا کہ یہ ہمارے پورے محکمے کی بدنامی ہے فوراً ایکشن لیا جائے اور اس پروڈیوسر کا Explanation آدھے گھنٹے کے اندر اندر مجھے بھیجا جائے۔ اس نوٹ کی زبان ان کے عہدے کے اعتبار سے ساقط المعیار تھی۔ مجھے ڈیوٹی افسر نے بلا کر وہ نوٹ دکھایا۔ میں سکتے میں آگیا۔ ابھی اس بلائے ناگہانی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ گوپال داس جی کا فون آگیا۔ میں نے ان کو سچ سچ سب کچھ بتا دیا کہ اس سے جھگڑا ہوا مگر گالی گلوچ ہوئی نہ مار پیٹ۔ انھوں نے کہا کہ تم بے فکر رہو، آج اور کل چھٹی ہے، پرسوں سوچا جائے گا۔ پیر کے روز گوپال داس جی نے مجھے بلایا اور مجھ سے کہا کہ میں نے جے.بی. ماتھر صاحب سے بات کرلی ہے کہ میں اس ایم. پی. محمد طارق کو بھی جانتا ہوں۔ (وہ کبھی کشمیری نیوز میں ان کے ماتحت کام کرچکا تھا) اور رفعت سروش کو بھی۔ رفعت اس سے کہیں زیادہ مہذب اور با اخلاق ہے۔ انھوں نے ڈی.جی. کے نوٹ کو پھاڑ کر پھینک دیا اور مجھ سے کہا کہ تم چاہو تو اس ایم. پی. کو فون کرلو۔ میں نے کہا: نہیں، میں اسے فون نہیں کرنا چاہتا۔ بس بات وہاں ختم ہوگئی۔ کوئی ایکشن نہیں ہوا۔ اب اگر کوئی دبو قسم کا اسٹیشن ڈائرکٹر ہوتا تو شاید ڈائرکٹر جنرل کے نوٹ پر مجھے برخاست کیا جاسکتا تھا یا کم از کم معطل تو فوراً ہی کردیا جاتا مگر گوپال داس جی نے کمال جرأت سے ڈی.جی. کے روبرو میری پیروی کی اور مجھ پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔

آج میں سوچ رہا ہوں کہ اس واقعے سے ایک ممبر پارلیمنٹ کا غرور، ڈائرکٹر جنرل کا افسر اعلیٰ ہونے کے باوجود ''یس سر'' والا رویہ اور گوپال داس جی کی حق پرستانہ روش، اس بیباکی اور دلیری کو ظاہر کرتی ہے، جو ان کے کردار کا حصہ تھی۔ کچھ عرصے بعد گوپال داس جی کا تبادلہ گوہاٹی کر دیا گیا تھا اور میرا خیال ہے کہ اس کی تہہ میں ان کا جی بی. ماتھر کی ہاں میں ہاں نہ ملانا بھی ہوگا۔ بحیثیت براڈ کاسٹر گوپال داس جی، جے بی. ماتھر سے سینئر تھے، کیونکہ یہ صاحب تو آزادی کے بہت بعد آئی سی ایس ہونے کے باعث سیدھے ڈائرکٹر جنرل بن گئے تھے۔

گوپال داس جی کے تبادلے کے بعد وودھ بھارتی یونٹ منتشر ہونا شروع ہوگیا۔ پروگراموں کا معیار گرنے لگا۔ وہ لوگ ادھر ادھر ہوگئے۔ جنھوں نے اس لاڈلے کو پالنے میں جھلایا تھا اور پروان چڑھایا تھا۔ ستیندر شرت دلی اسٹیشن کے ڈراما سیکشن میں چلے گئے اور میں بھی موقع پاکر دہلی اسٹیشن پر ہی اردو مجلس میں چلا گیا۔

آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد گوپال داس صاحب کچھ عرصے کے لیے ایک خودمختار نیم سرکاری ادارے کتھک کیندر کے سربراہ رہے اور انھی دنوں انھوں نے مجھ سے اوپیرا ''حبہ خاتون'' لکھوایا جس کی موسیقی اور رقص پنڈت برجو مہاراج نے ترتیب دیے تھے۔ سرکاری دفتروں میں نمایاں طور پر کام کرنے کے بعد ایک خوددار آدمی غیر سرکاری اور دوسرے اداروں میں زیادہ دن تک کام نہیں کرسکتا کیونکہ وہاں ایک طرح سے شخصی قسم کی ملازمت ہوتی ہے۔ (میں خود اس تجربے سے گزر چکا ہوں) گوپال داس جی نے کتھک کیندر کی ملازمت ایک ڈیڑھ سال میں ہی ترک کردی اور اس کے بعد اپنی باقی عمر جے پور میں اپنے گھر گزاری۔ ادب کے شوقین، نئی نئی کتابوں کے مطالعے کے عادی۔ مجھے کچھ سال قبل جے پور میں ان کے دولت خانے پر حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ وہی خلوص، وہی ملنساری۔ آخری ایام تکلیف میں گذرے۔ بینائی بہت کم ہوگئی تھی اس کے علاوہ ان کی بیگم عرصے سے بیمار تھیں اور ہیں۔ ان کو بول و براز کا بھی ہوش نہیں۔ گوپال داس جی ان کے قریب آرام کرسی بچھا کر سوتے اور جاگتے رہتے تھے۔ پتہ نہیں کب انھیں ضرورت پڑ جائے۔ گوپال داس جی تو چلے گئے مگر ان کی بیگم ابھی اسی حالت میں بہ قید حیات ہیں۔ ان کے کوئی بیٹا نہیں، اپنی بیٹی کے گھر رہتی ہیں۔

گوپال داس جی کے انتقال کے ساتھ آل انڈیا ریڈیو کے زرّیں دور کا آخری بزرگ بھی دنیا سے اٹھ گیا۔ ریڈیو چلتا ہے، چلتا رہے گا، آوازیں فضا اور خلا میں گردش کرتی رہیں گی، مگر وہ لوگ واپس نہیں آئیں گے جنھوں نے آل انڈیا ریڈیو کو نئی رفعتوں تک پہنچایا ہے۔

اور اب تو وہ سانچہ ہی ٹوٹ گیا جس میں گوپال داس جی جیسی شخصیتوں کی تربیت ہوتی تھی۔ اب تو لوگ کلرکوں کی طرح بھرتی ہوتے ہیں اور سرکتے سرکتے اسٹیشن ڈائرکٹر بن جاتے ہیں۔

□□□

پتہ:
204, Saba Apartment,
D-3, Sector-44, Noida-201301 (U.P.)

دیوان درد

مرتب: ڈاکٹر نسیم احمد

خواجہ میر درد اردو کے صرف صوفی شاعر ہی نہیں بلکہ ان کی غزلیہ شاعری غزل کی اس توانا روایت کا حصہ ہے جس کی نمائندگی اعلیٰ سطح پر میر تقی میر کر رہے تھے لیکن افسوس کہ درد کی وفات کے بہت بعد ان کے کلام کی اشاعت ہو پائی اور وہ بھی اختلافات متن کے ساتھ۔ ہندوپاک میں ''انتخاب کلام درد'' اور ''دیوان درد'' کے انھی متعدد مطبوعہ و غیر مطبوعہ نسخوں کے پیش نظر ڈاکٹر نسیم احمد نے ''دیوان درد'' کا یہ نسخہ ترتیب دیا ہے اور اس کی تفصیلی وضاحت مقدمے میں کردی ہے۔

صفحات: 336، قیمت: -/160 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبه اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

اقبال محی الدین

ریڈیو کی کہانی اور آکاش وانی

قوم کی تعمیر میں ذرائع ابلاغ ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں جن سے عوام کو ملک کے ترقیاتی پروگرام کے بارے میں علم ہوتا رہتا ہے۔ ریڈیو کے پروگرام زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ہوتے ہیں جو بہت دلچسپ انداز میں پیش کیے جاتے ہیں جس سے لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں اور خبروں سے بھی آشنا ہوتے رہتے ہیں۔

سائنسی ٹیکنالوجی اور تحقیقات پر ہمیں بہت حد تک منحصر رہنا پڑتا ہے۔ ملک کے اندرونی و بیرونی حالات کے بارے میں ہر وقت کی اطلاع حاصل کرنے کے لیے ریڈیو بہت کارگر ثابت ہوا ہے۔ بغیر تار کی اس مشین سے ہزاروں کلومیٹر کی خبریں فوراً موصول ہو جاتی ہیں۔

ریڈیو کی اہمیت ہماری زندگی میں بہت ہے۔ سارے ترقیاتی پروگرام، خبریں، کلچرل پروگرام ہم روزمرہ سنتے رہتے ہیں اور ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ موسم کی پہلے سے اطلاع مل جانے سے ہم اپنے کام اسی کے مطابق کرتے ہیں۔ سمندر میں مچھلیاں پکڑنے والوں کو طوفان کی اطلاع ریڈیو سے ہی دی جاتی ہے۔ ملک کے کس حصے میں کیسا موسم ہوگا اس بات کی اطلاع بھی ریڈیو سے ملتی رہتی ہے۔ پولیس، فوج، ہوائی جہاز، ریل، ڈاک، تار وغیرہ شعبہ جات میں ریڈیو بہت کارگر ثابت ہوتا ہے۔ سیٹلائٹ کے ذریعے بھی ریڈیو سگنل موصول ہوکر ہر طرح کی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ اس طرح ہماری زندگی بہت آرام دہ اور محفوظ ہوگئی ہے۔ یہ ساری سہولتیں ریڈیو ہی کی دین ہیں۔

ریڈیو کن اصولوں پر بنایا گیا ہے: کیا کبھی آپ نے اس پر غور کیا ہے کہ ریڈیو کیسے کام کرتا ہے؟ اور بغیر تار کی اس مشین میں دور دراز سے خبریں، گانے اور طرح طرح کے پروگرام کیسے ہم تک پہنچتے ہیں۔ آیئے ہم آپ کو تفصیل سے اس کے بارے میں ایک مثال کے ذریعے سمجھاتے ہیں۔

اگر آپ ایک تالاب کے کنارے کھڑے ہوکر ایک پتھر تالاب میں پھینکیں تو پہلے پانی اُچھلتا ہے، پھر پتھر ڈوب جاتا ہے مگر پانی پر لہریں بننے لگتی ہیں۔ جہاں پانی پر پتھر گرتا ہے وہاں لہریں چھوٹا دائرہ بناتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی ہیں اور لہروں کا دائرہ بڑا ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ تالاب کے آخر تک پہنچتے پہنچتے بڑے دائرے کی شکل میں لہریں پہنچ جاتی ہیں۔ یہ لہریں کیسے بنتی ہیں؟ جب آپ نے پتھر پانی میں پھینکا تو اس کام میں آپ کو اپنی طاقت کا استعمال کرنا پڑا جس کی وجہ سے پتھر ہوا میں سے گزر کر پانی پر گرا۔ پتھر کے پانی پر گرتے ہی پانی مضطرب ہوا اور پتھر کے ڈوبنے سے پانی اوپر نیچے ہوا اور لہروں کے دائرے کی شکل میں پورے تالاب میں پھیل گیا۔ دیکھنے میں یہ لہروں کے دائرے تالاب میں بہت خوبصورت لگتے ہیں، لیکن ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ ہمارے لیے کیسے کارآمد ہیں؟

مچھلی مارنے والی راڈ کے دھاگے میں ایک کارک کا ٹکڑا باندھ دیجیے اور پانی میں اسے ڈال دیجیے۔ کارک پانی پر تیرنے لگے گا۔ اب ایک پتھر پھر تالاب کے پانی پر پھینکیے، پھر ویسی ہی لہروں کا دائرہ بننے لگے گا جس کی وجہ سے کارک کا ٹکڑا پانی کی لہروں پر ڈوبتا، تیرتا دکھائی دے گا۔ ایسا کیوں ہوا؟ ایسا اس لیے ہوا کہ ''طاقت'' نے لہروں کو پیدا کیا جس نے کارک کو پتھر کے ڈوبنے کی جگہ سے دوسری جگہ تک تیرایا جس کو ہم ''لہروں کی طاقت'' کہہ سکتے ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''طاقت'' لہروں کے ذریعے سفر کرسکتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر ایک لمبی رسّی کو دروازے سے باندھ کر دوسرا سرا پکڑ کر ہلائیں تو وہ اسی لہر دار شکل میں اوپر نیچے ہوگی۔ جب رسی کو ہلایا جاتا ہے تو ''طاقت کی لہر'' پیدا ہوکر دروازے تک پہنچتی ہے۔

ہم لہریں اس وقت پیدا کرسکتے ہیں جب پانی میں پتھر پھینکیں یا رسّی کے ایک سرے کو پکڑ کر ہلائیں تو دونوں مضطرب (Disturb) ہوکر لہریں پیدا کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ پانی یا رسّی کو اگر Disturb نہ کیا جائے تو لہریں نہیں پیدا ہوں گی۔

اب ہمیں ان لہروں کے بارے میں بھی جاننا چاہیے جن کو ہم ہر وقت استعمال کرتے رہتے ہیں لیکن دیکھ نہیں سکتے۔ یہ ''آواز کی لہریں'' ہیں۔ ہر مرتبہ جب ہم بولتے ہیں تو ہوا کو Disturb کرکے اس میں آواز کی لہریں پیدا کرتے ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جیسے پتھر نے پانی کو Disturb کرکے لہریں پیدا کی تھیں۔ یہ ''ہوا کی لہریں'' بولنے میں جو طاقت صَرف ہوئی اس سے پیدا ہوئیں اور تالاب کی دائرہ دار لہروں کی طرح وہ بھی ہوا میں سفر کرتے ہوئے سننے والے تک پہنچیں۔ ہمارے کان ان لہروں کو کیسے سنتے ہیں۔ اس کی مثال اس کارک کے ٹکڑے کی ہے جو راڈ میں بندھا ہوا پانی کی لہروں کے دباؤ سے اوپر نیچے تیرتا رہتا ہے۔ جب ہوا کی لہریں کان کے پردے سے ٹکراتی ہیں تو وہ کارک کی طرح لہروں کی شکل میں اوپر نیچے ہوتی رہتی ہیں اور دباؤ ڈالتی ہیں۔ کان کے پردے ایسی آواز کی لہروں کو دماغ تک پہنچا دیتے ہیں جو آواز کی

پہچان کراتا ہے اور ہم اس کو سن کر سمجھ لیتے ہیں۔ ان لہروں کے ساتھ دشواری یہ ہے کہ یہ بہت دور تک سفر نہیں کرسکتیں۔

لیکن ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارے پاس دوسری طرح کی ''طاقت کی لہریں'' بھی ہیں جو کافی دور تک جاسکتی ہیں۔ ان لہروں کو بجلی کے ذریعے پیدا کیا جاتا ہے۔ ان ''بجلی کی لہروں'' کو مشین کے ذریعے پیدا کیا جاسکتا ہے اور جہاں تک چاہیں بھیجا جاسکتا ہے۔ ان کو ایک خاص مشین کے ذریعے دیکھا اور سنا بھی جاسکتا ہے۔ بجلی کی لہروں اور ان کے Track کے لیے Magnetism کی ضرورت ہوتی ہے۔ بغیر مقناطیسی طاقت کے نہ تو بجلی کی روشنی ہوسکتی ہے، نہ ٹیلی فون کام کرسکتا ہے، نہ ٹیلی گراف، نہ ریڈیو اور نہ ٹیلی ویژن کام کرسکتا ہے۔

''آواز کی لہروں'' کو Electromagnetic Waves کے ذریعے نشر کیا جاتا ہے جس کے سگنل لہر دار دائروں کی شکل میں ہم تک پہنچتے ہیں جس کو ہمارا ریڈیو Catch کرکے دوبارہ ویسی ہی لہریں پیدا کرکے آواز میں تبدیل کردیتا ہے۔ اس طرح ریڈیو انھی برقی لہروں کے دائرے کے اصول پر بنایا گیا ہے جس کو ٹرانسمیٹر ٹاور تک پہنچایا جاتا اور ٹاور ان برقی لہروں کے دائروں کو دور دراز تک بھیج دیتا ہے، جہاں ریڈیو سیٹ ان کو Catch کرکے دوبارہ آواز میں تبدیل کردیتا ہے۔ یہ سارا عمل اتنی تیزی سے ہوتا ہے کہ ایک لفظ کا سلسلہ ٹوٹنے بھی نہیں پاتا کہ دوسرا لفظ اس کے بعد آجاتا ہے اور ہم پورا پروگرام بغیر کسی رکاوٹ کے سنتے ہیں۔

ہندوستان کا برقی میڈیا — آکاش وانی: ہندوستان میں براڈ کاسٹنگ، پرائیویٹ ٹرانسمیٹر کے ذریعے ممبئی اور کولکاتا میں 1927 میں شروع ہوئی تھی۔ گورنمنٹ نے 1930 میں ان ٹرانسمیٹرس کو لے لیا اور انڈین براڈ کاسٹنگ سروس (IBS) کے نام سے نشریات کا سلسلہ شروع ہوا۔ 1936 میں IBS کا نام تبدیل ہوکر آل انڈیا ریڈیو (AIR) ہوا اور 1957 میں یہ پھر تبدیل ہوکر آکاش وانی کے نام سے مشہور ہوا۔ دلچسپ پروگرام کے ساتھ ساتھ لوگوں تک اطلاعات پہنچانے اور ان کو تعلیم دینے کے لیے آل انڈیا ریڈیو پُر زور میڈیم ہے۔

براڈ کاسٹنگ نیٹ ورک: آکاش وانی کا براڈ کاسٹنگ نیٹ ورک بہت عمدہ ہے جس میں 160 نشریاتی مراکز ہیں اور ان کے 152 مکمل اسٹیشن ہیں۔ 3 ریلے سنٹر ہیں اور 2 Auxiliary مراکز ہیں۔ اور 3 وودھ بھارتی کامرشیل مراکز ہیں۔ یہاں 140 MW کے ٹرانسمیٹر ہیں۔ 43 شارٹ ویو ٹرانسمیٹر اور 73 ایف۔ایم ٹرانسمیٹر ہیں۔ اس وقت 80.2 فیصد ہندوستان کے رقبے کو اور 96.3 فیصد آبادی کو آل انڈیا ریڈیو Cover کرتا ہے۔

موسیقی: آکاش وانی نے موسیقی کے میدان میں بھی بہت نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس نے کلاسیکل، لائٹ، فوک اور ٹرائبل اور مغربی طرز کی موسیقی سے روشناس کرایا ہے۔ مکمل براڈ کاسٹ کے وقت کا 40 فیصد حصہ موسیقی کے پروگرام کو دیا جاتا ہے۔ موسیقی کا قومی پروگرام ہر سنیچر کو نشر ہوتا ہے۔ آکاش وانی سنگیت سمیلن میں چوٹی کے موسیقاروں کو مدعو کیا جاتا ہے اور اتوار کو مخصوص آرٹسٹوں کا پروگرام نشر کیا جاتا ہے۔

ہر سال آل انڈیا نئی نسلوں کے موسیقاروں میں مقابلہ کراتا ہے اور نئے نئے لوگوں کو ریڈیو کے پروگرام میں موقع دیتا ہے۔ نیشنل آرکسٹرا کے دو یونٹ ہیں جن کو A.I.R. Vadya Vrinda کہتے ہیں۔ وہ دہلی اور چنئی میں کام کر رہے ہیں۔ تیاگ راج اور تان سین موسیقی کے تہواروں کو آل انڈیا ریڈیو قومی سطح پر نشر کرتا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو آرکائیوز مختلف اسٹیشنوں کے کلاسیکل فوک اور ٹرائبل میوزک سے مالا مال ہیں۔ سارے پروگراموں کی اطلاع سب اسٹیشنوں کو پہلے سے دی جاتی ہے۔ AIR نے 1993 میں کامن ویلتھ موسیقی کے مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا تھا۔ یہ مقابلہ انگلستان میں ہوا تھا۔ 22 ممالک نے اس مقابلے میں حصہ لیا تھا۔

وودھ بھارتی: وودھ بھارتی کے مقبول پروگرام 34 مراکز سے نشر کیے جاتے ہیں جن میں تین Short Wave Transmitters دہلی، ممبئی اور چنئی میں قائم کیے گئے ہیں۔ پورے پروگرام کا وقت ہفتہ میں 13 گھنٹے اور 15 منٹ ہے جبکہ اتوار اور چھٹی کے دنوں میں 13 گھنٹے اور 45 منٹ ہے۔ فلمی گانے، مزاحیہ پروگرام، ڈرامے اور فیچر پروگرام وودھ بھارتی میں نشر کیے جاتے ہیں۔

تجارتی نشریات: 1967 میں ممبئی، پونے اور ناگپور سے پہلی مرتبہ تجارتی نشریات آل انڈیا ریڈیو سے شروع کی گئیں۔ بعد میں 30 دوسرے مراکز پر بھی یہ نشریات شروع ہوئیں۔ اشتہارات 10، 15، 20 اور 30 سیکنڈ وقفے والے ریکارڈ کیے گئے پروگرام ہوتے ہیں۔ Sponsored پروگرام مئی 1970 سے شروع کیے گئے۔ کمرشیل سروس پرائمری چینل پر 26 جنوری 1985 سے A.I.R. 55 اسٹیشنوں سے شروع کی گئی۔ اب پرائمری چینل اسٹیشن 60 تک پہنچ گئے ہیں۔ وودھ بھارتی اور پرائمری چینل کے تجارتی نشریات سے حال ہی میں 60 کروڑ روپے ریونیو موصول ہوا۔

ریڈیو ڈرامے: جب سے ریڈیو نشریات شروع ہوئیں ریڈیو ڈرامے بہت مقبول ہوئے ہیں۔ مختلف علاقائی زبانوں میں ریڈیو ڈرامے نشر کیے جاتے ہیں۔ بہت سے ریڈیو اسٹیشن ڈرامے کے سیریل پیش کرتے ہیں جن میں خاندانی زندگی، ترقیاتی منصوبے، سماجی اور اقتصادی مسائل کے بارے میں روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ڈراموں کے قومی پروگرام میں ہر مہینے کی چوتھی جمعرات کو ہندی زبان میں ریڈیو ڈراما نشر کیا جاتا ہے۔ ہر زبان کے ڈراموں کے مسودوں کو

دیکھا جاتا ہے اور جوان میں بہترین ہوتے ہیں ان کو ہندی میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔ علاقائی زبان میں لکھے ہوئے ڈرامے بھی ساتھ ساتھ دوسرے اسٹیشنوں سے نشر کیے جاتے ہیں۔ ان ڈراموں کے علاوہ مشہور ناولوں اور دلچسپ کہانیوں کو بھی ڈرامائی انداز سے پیش کیا جاتا ہے۔ ہر سال ہاسیہ ترنگ مزاحیہ پروگرام بھی نشر کیے جاتے ہیں۔

نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کے لیے ڈراموں کے مسودوں کا مقابلہ بھی 1987 میں شروع کیا گیا۔ 93-1992 میں 5000 ڈراموں کے مسودے موصول ہوئے۔ اوّل نمبر پر آنے والے ڈراما اسکرپٹ پر دس ہزار روپے کا انعام دیا گیا۔ دوسرے نمبر کو پانچ ہزار روپے اور تیسرے نمبر کو تین ہزار روپے کا انعام دیا گیا۔ ہر سال یہ مقابلہ منعقد کیا جاتا ہے۔

خبریں اور روزمرّہ کے واقعات: خبروں کی نشریات کی تاریخ آل انڈیا ریڈیو کے وجود سے پہلے کی ہے۔ خبروں کا پہلا بلیٹن 23 جولائی 1927 کو پرائیویٹ ریڈیو اسٹیشن، ممبئی سے نشر کیا گیا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کا نیوز آرگنائزیشن اگست 1937 میں قائم کیا گیا اور پہلا نیوز بلیٹن دہلی سے نشر کیا گیا تھا۔ 40-1939 تک آل انڈیا ریڈیو 27 نیوز بلیٹن دینے لگا تھا اور اس مرکز کو سنٹرل نیوز آرگنائزیشن کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بعد میں یہی تبدیل ہوکر نیوز سروس ڈویژن (N.S.D.) ہوگیا۔ 1943 میں External Broadcast Unit قائم کیا گیا۔

آل انڈیا ریڈیو روزانہ 290 نیوز بلیٹن نکالتا ہے ان میں سے 89 بلیٹن ہوم سروس سے نشر کیے جاتے ہیں جو 12 گھنٹے اور 10 منٹ کے وقفے کے ہوتے ہیں۔ جب کہ 136 نیوز بلیٹن 41 علاقائی نیوز یونٹوں سے نشر کیے جاتے ہیں جن کا وقفہ 18 گھنٹے اور ایک منٹ کا ہوتا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کی بیرونی سروس سے 65 بلیٹن روزانہ نشر کیے جاتے ہیں جن کا وقفہ 8 گھنٹے اور 59 منٹ ہوتا ہے۔

سماچار پربھات میں ہندی اور انگریزی نیوز بلیٹن ہوتے ہیں جو صبح کے وقت نشر کیے جاتے ہیں۔ ان میں اخباروں کی خاص خاص سرخیوں پر تبصرہ بھی ہوتا ہے۔ 2 اکتوبر 1991 سے ہر گھنٹے پر خبریں رات کے ایک بجے سے صبح کے پانچ بجے تک نشر کی جاتی ہیں۔ پریس کا تبصرہ بھی روزانہ نشر کیا جاتا ہے۔ حج کے زمانے میں ہر پانچ منٹ پر خاص بلیٹن حاجیوں کی آسانی کے لیے نشر کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ نیوز سروسیز ڈویژن خبروں پر مرکوز پروگرام پیش کرتا رہتا ہے۔ معاشی پالیسی اور اصلاح پر مرکوز پروگرام 25 ریجنل نیوز یونٹ (R.U.Us) سے نشر کیے جاتے ہیں۔ حال ہی میں 9 ریجنل نیوز یونٹ فی الوقت کام کررہے ہیں۔ پارلیمنٹ اور اسمبلی کی کارروائی کو بھی آکاش وانی نشر کرتا رہتا ہے۔ پروڈیکٹ ڈیسک سے یہ سارے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

پی.ٹی.آئی، یو.این.آئی اور ہندی سروس ''بھاشا'' اور ''یونی وارتا'' آل انڈیا ریڈیو کے نامہ نگار ہیں جو آکاش وانی کو خبریں بھیجتے رہتے ہیں۔

مونی ٹرنگ یونٹ (Monitoring Unit) جو جنرل نیوز روم سے متعلق ہے وہ قومی اور بین الاقوامی خبریں دیتا رہتا ہے جس کو آل انڈیا ریڈیو نشر کرتا رہتا ہے۔

ایکسٹرنل سروسیز ڈویژن (ESD): آکاش وانی کا ایکسٹرنل سروسیز ڈویژن (ESD) روزانہ 24 زبانوں میں پروگرام نشر کرتا ہے، وقفہ 71 گھنٹے ہے۔ اس کے علاوہ 16 غیر ملکی زبانوں میں اور 8 ہندوستانی زبانوں میں بھی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ موجودہ حالات پر، ہندوستانی پریس کے تبصرے، نیوز ریل پروگرام، میگزین پروگرام، کھیلوں اور ادب پر اور کلچرل موضوعات پر پروگرام E.S.D. نشر کرتا ہے۔ قومی زندگی کے ترقیاتی پروگراموں کے فیچر، ضروری واقعات، ادارے، موسیقی، کلاسیکل، فوک اور جدید ہندوستانی موسیقی، ملک اور بیرون ملک کے لیے نشر کیے جاتے ہیں۔

مغربی ایشیا کی سروس عربی میں (3 گھنٹے 15 منٹ)، دری (1 گھنٹے 15 منٹ)، فارسی (2 گھنٹے 45 منٹ)، پشتو (2 گھنٹے) اور بلوچی (1 گھنٹہ) پروگرام روزانہ نشر کرتی ہے۔ مشرقی افریقی ممالک کے لیے E.S.D. سواہلی زبان میں 2 گھنٹے کا پروگرام روزانہ نشر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندی سروس (4 گھنٹے 15 منٹ) کے پروگرام بھی نشر کرتا ہے۔ فرنچ سروس (45 منٹ) کا پروگرام مغربی اور شمالی افریقہ کے لیے نشر ہوتا ہے۔ دوسری Area-Oriented Services روسی زبان میں (ایک گھنٹے)، برمی زبان میں (1 گھنٹہ 30 منٹ)، چینی زبان میں (1 گھنٹہ 30 منٹ) انڈونیشین زبان میں (ایک گھنٹہ) سنہالہ زبان میں (2 گھنٹے) تھائی زبان میں (45 منٹ) نیپالی میں (3 گھنٹے) اور تبتی زبان میں (ایک گھنٹے 45 منٹ) کے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ جو ہندوستانی باہری ممالک میں رہتے ہیں ان کے لیے بھی E.S.D. پروگرام نشر کرتا ہے جو آٹھ زبانوں میں ہوتے ہیں۔ یہ زبانیں ہیں بنگالی (6 گھنٹہ 30 منٹ)، تمل (7 گھنٹے 30 منٹ)، تیلگو (30 منٹ) اور اردو (12 گھنٹے 15 منٹ)۔

ایکسٹرنل سروسیز ڈویژن کلچرل تبادلہ پروگرام کے تحت گانوں کی ریکارڈنگ اور دوسرے پروگرام تقریباً 100 ممالک کے Foreign Broadcasting Organizations کو دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر سنیچر کو یو.این.نیوز کو دنیا کے مختلف ممالک کے لیے نشر کرتے ہیں۔

ایکسٹرنل سروسیز ڈویژن ایک ماہانہ پروگرام کا انگریزی میگزین بھی نکالتا ہے جس کو "India Calling" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ جنرل باہری ممالک کے سننے والوں کو مفت دیا جاتا ہے۔

سنٹرل مونی ٹرنگ سروس (CMS): آکاش وانی کی سنٹرل مونی ٹرنگ سروس نومبر 1939 میں دہلی میں شروع ہوئی۔ مارچ 1940 میں یہ سنٹر شملہ لے جایا گیا تاکہ اونچے مقامات کی مونی ٹرنگ آسانی سے ہو سکے۔ اسی سال اس سروس کو ڈپارٹمنٹ آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ کے تحت لایا گیا۔ 1981 میں سنٹرل مونی ٹرنگ سروس، آیا نگر، نئی دہلی میں قائم کردی گئی۔ یہ یونٹ غیر ملکی نشریات کا علم آل انڈیا ریڈیو کو دیتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ N.S.D. وزارت داخلہ، وزارت دفاع، وزارت خارجہ اور انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ کو بھی نشریات کی تفصیل دیتا رہتا ہے۔

سنٹرل مونی ٹرنگ سروس (CMS) اپنے پروگرام کو 180 ٹرانسمٹرس کے ذریعے 32 غیر ملکی اسٹیشنوں سے وصول کرتا ہے اور ان کو مونی ٹر کرتا رہتا ہے۔ ہندوستانی زبانوں کی نشریات کے علاوہ یہاں 6 غیر ملکی زبانوں میں بھی مونیٹرنگ ہوتی ہے۔

آڈینس ریسرچ یونٹ (A.R.U.): آل انڈیا ریڈیو کا Audience Research Unit آکاش وانی کے سارے پروگراموں کے بارے میں جن میں تجارتی نشریات سروس اور E.S.D. بھی شامل ہیں، سامعین کی رائے سے مطلع کرتا ہے۔ ان کی رائے کی روشنی میں آنے والے پروگراموں میں سدھار کیا جاتا ہے۔ یہ یونٹ A.I.R. کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ دراصل سامعین اور A.I.R. کے درمیان رابطے کی کڑی ہے۔ عوام کی ضروریات، امیدوں اور مزاج کو سمجھنے کے لیے Audience Research یونٹ اہم خدمت انجام دیتا ہے۔ یہ یونٹ Reference Data بھی رکھتا ہے تاکہ الگ الگ ریڈیو اسٹیشن یا لوگ ان کا ریسرچ میں استعمال کریں۔ اس کے 43 ریسرچ یونٹ دہلی، الہٰ آباد، شیلانگ، ممبئی، کولکاتا اور چنئی میں ہیں۔ ان کے علاوہ ایک کمرشیل براڈ کاسٹنگ سروس ممبئی میں ہے۔

ٹرانس کرپشن اور پروگرام ایکس چینج سروس (T.P.E.S.): آل انڈیا ریڈیو کی ٹرانس کرپشن اور پروگرام ایکس چینج سروس (T.P.E.S.) کے تین بنیادی شعبے ہیں جن کو Transcription, Sound, Archives اور Programme Exchange Units کے نام سے جانا جاتا ہے۔ AIR Sound Archives میں موسیقی کے ریکارڈ، ریڈیو سنگیت سمیلن، ڈرامے وغیرہ کے ریکارڈ رکھے رہتے ہیں۔ صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم کی تقاریر کی ریکارڈنگ بھی یہی یونٹ اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے۔ یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ مہاتما گاندھی کی آواز کی 50 گھنٹے کی ریکارڈنگ بھی اسی یونٹ کے پاس محفوظ ہے۔ دو ہزار Tapes پنڈت جواہر لعل نہرو کی آواز کے بھی اسی یونٹ کے پاس رکھے ہوئے ہیں۔

پروگرام Exchange یونٹ Test Transmission سپلائی کرتا ہے۔ کسی مشہور آدمی کی موت پر پروگرام، زبان سیکھنے کا سبق، کمیونٹی گانے اور دوسرے گانے، تقریریں اور انٹرویو وغیرہ کے پروگرام دوسرے اسٹیشنوں سے Receive کرکے لینے والے اسٹیشنوں کو دیتا رہتا ہے۔ یہ مغربی طرز کے گانوں کے پروگراموں کو Foreign Broadcasting Agencies سے حاصل کرکے اپنے ملکی ریڈیو اسٹیشنوں کو دیتا ہے اور اب سٹلائٹ کے ذریعے حاصل شدہ پروگراموں کو بھی سپلائی کرتا ہے تاکہ یہاں کے اسٹیشن ان کو نشر کر سکیں۔

دیہی پروگرام: دیہی پروگرام آکاش وانی کے تقریباً ہر اسٹیشن سے نشر کیے جاتے ہیں۔ 1966 میں آکاش وانی نے فارم اینڈ ہوم یونٹ قائم کیا تھا۔ اس یونٹ کا کام کھیتی سے متعلق معلومات فراہم کرانا تھا۔ سائنسی طریقے سے کھیتی میں کیسے فروغ ہو اور جانوروں کی نسلوں میں کیسے سدھار کیا جائے اور دیگر اہم معلومات دیہی پروگرام کے تحت پیش کی جاتی ہیں۔ مٹی کی قسموں اور ان کی کھیتی میں مناسبت اور پانی، کھاد یا کیمیائی کھاد کا استعمال، پودوں کی حفاظت، غلّے کو کیسے اور کہاں رکھا جائے اور بازار میں پیداوار و فروخت جیسی اہم معلومات بھی آل انڈیا ریڈیو کا دیہی پروگرام پیش کرتا ہے۔ اس پروگرام کا وقفہ 21 سے 45 گھنٹے تک ایک ماہ میں ہوتا ہے۔ دیہی خواتین اور بچوں کے لیے خاص پروگرام بھی یہ یونٹ نشر کرتا رہتا ہے۔

□□□

پتہ:
46, Nishat Apartment,
Near Shamshad Market, AMU, Aligarh (U.P.)

گزارش

ماہنامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' کے قلم کاروں سے گزارش ہے کہ وہ اپنی نگارشات صاف، خوشخط یا کمپوز شدہ بھیجیں۔ تحریر گنجلک ہونے کی صورت میں اس کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا۔

احسان اللہ احمد

ربڑ ٹیکنالوجی

مہم جو، جہاز راں سیاح کرسٹوفر کولمبس 1493 میں اپنے وطن سے نکلا تو اس لیے تھا کہ یورپ سے ہندوستان کے لیے جو اس زمانے میں سونے کی چڑیا کہلاتا تھا، ایک محفوظ اور نزدیک ترین سمندری راستہ ڈھونڈ نکالے مگر قدرت نے اسے جنوبی امریکہ کے ساحلوں پر پہنچا دیا۔

ہیٹی (Haiti) کے مقام پر اس نے دیکھا کہ مقامی لوگ ایک گیند سے کھیل رہے ہیں جو خود سے اچھلتی ہے اور اچھلتے ہوئے دور تک جاتی ہے۔ اس نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ وہاں کے اکثر لوگ ایسے جوتے پہنتے ہیں جن پر پانی کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اسے یہ بتایا گیا کہ یہ گیند اور یہ جوتے ایک درخت، جسے وہ لوگ اُلی (Ulli) کہتے ہیں، کے رسنے والے عرق سے جو سفید اور دودھ کی مانند ہوتا ہے، تیار کرتے ہیں۔ اس عرق کو جو منجمد ہو جاتا ہے وہ لوگ کاچک نام دیتے تھے جس کے معنی مقامی زبان میں روتا ہوا درخت ہوتے ہیں۔ ہسپانوی باشندوں نے جو اس سے سب سے پہلے متعارف ہوئے اس کا کاوچو (Cauchu) نام دیا۔ فرانس والے اسے کاؤچو (Caoutchoue) کہنے لگے جس کا مطلب بہنا (Flow) یا رونا (weep) ہوتا ہے۔ انگریزوں نے بہت بعد میں اسے ربڑ (Rubber) کا نام دیا۔ ہوا یہ کہ اس زمانے کے مشہور سائنسداں جوزف پریسٹلی نے جس نے آکسیجن کی دریافت کی تھی، اپنی تجربہ گاہ میں یہ مشاہدہ کیا کہ اس منجمد عرق کے کچھ حصے کو ایسے کاغذ پر جس پر پنسل سے لکھی ہوئی تحریر ہو گھسا جائے (Rub) تو پنسل سے لکھی ہوئی تحریر معدوم ہو جاتی ہے، مٹ جاتی ہے، پریسٹلی نے اسے Rub سے ربڑ (Rubber) کہنا شروع کیا۔ اب اکیسویں صدی میں اگر چہ گھسنے کا کام تو محدود ہو گیا ہے مگر اس شے کا نام ربڑ ہی چل رہا ہے۔

ہیٹی میں پائے جانے والے ان درختوں کو ماہرین نباتیات نے اپنی تحقیقات کا محور بنایا اور ان میں سے ایک درخت کو سائنٹفک یا بوٹانیکل نام 1747 میں Hevea Braziliansis دیا۔ بعد میں یہی درخت ربڑ کی پیداوار کے لیے مفید درخت مانا گیا۔

ربڑ کے درختوں پر تحقیق کے سلسلے میں دو اہم نام سامنے آتے ہیں۔ یہ ہیں (1) چارلس ایم ڈی لاکونڈامن (Charles M de la Condamin) اور (2) سی فرانکوئس فرنساؤ C.Francois Frensou۔ ان میں موخر الذکر نے اس درخت کے بارے میں تفصیلی رپورٹ تیار کی جسے اول الذکر نے پیرس اکیڈمی کے اجلاس 1751 میں پڑھ کر سنایا اور اپنا دور اندیشانہ خیال ظاہر کیا کہ ربڑ، تارپولین، پمپ کے Sleeves، غوطہ خوروں کے سوٹ، پانی کی بوتلوں، گھومنے والی مشینوں کے پٹے (Belt) اور دیگر کئی اقسام کی اشیا کی تیاری میں مدد معاون ہو سکتا ہے۔

دو فرانسیسی سائنسداں 1790 کی دہائی میں ایک ایسے محلل (Solvent) کی دریافت میں جٹ گئے، جو جنوبی امریکہ کے درختوں کے اس منجمد دودھ کو یورپ میں دوبارہ رقیق حالت میں تبدیل کر دے۔ کئی تجربات کے بعد انھوں نے دریافت کیا کہ ایتھر Ether اور ٹرپن ٹائین کا تیل Turpentine Oil موزوں محلل ہیں اس کے بعد یہ تجربے ہوئے کہ کپڑے پر اس رقیق ربر کی تہہ چڑھا دی جائے تو وہ موم جامہ ہو جاتا ہے، اس کپڑے پر پانی کا اثر نہیں ہوتا اور اس کے اندر رکھی جانے والی چیزوں تک پانی نہیں پہنچ سکتا۔

جیمز سائم (James Syme) نے 1818 میں دریافت کیا کہ کولتار کا ہائی اسپرٹ نیپتھا (High Spirit Naptha) منجمد ربڑ کا بہترین محلل ہے۔ اس دریافت کے بعد چارلس میکنٹاش (Charles Mcintock) کی گلاسگو گیس مینوفیکچرر نے بڑے پیمانے پر کولتار نیپتھا کی مدد سے واٹر پروف کپڑے بنانے شروع کیے۔ یہ پروڈکشن 1823 میں شروع ہوا اور یہ واٹر پروف کپڑے بہت مقبول ہوئے۔ مگر ان پارچوں میں یہ بات تھی کہ ربڑ کا محلول کپڑے پر اچھی طرح چسپاں نہیں ہوتا تھا اور سطح پر بدنما اور بھدے ذرات نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔

تھامس ہنکاک (Thomas Hancock) نے ربڑ کو رقیق بنانے کا ایک نیا طریقہ اپنایا۔ ایک بڑے اسطوانہ نما ڈرم میں اندرونی کناروں پر اس لوہے کی تیز نوکدار سلاخیں لگائیں اور درمیان میں ایک ایسا پرزہ نصب کر دیا جس کو ہاتھ سے گھمانے پر اسطوانے میں رکھے ہوئے منجمد ربڑ کے بڑے بڑے ٹکڑے عمودی اور دائروں کی شکل میں اٹھتے اور گردش کرتے ہوئے سلاخوں سے ٹکراتے تھے اور ٹوٹ پھوٹ کر ریزوں میں تبدیل ہو جاتے اور بعد میں محلل میں بہ آسانی حل ہو کر پارچے پر اچھی طرح چسپاں ہو جاتے تھے۔ حاسدوں اور کاروباری رقیبوں کے ڈر سے اس نے اس آلے اور طریقے کو پوشیدہ رکھا اور لوگوں میں یہی مشہور کیا کہ اس نے ایک ایسا تیز ابی محلول ایجاد کیا ہے جو ربڑ کے ٹکڑوں پر ڈال کر گھمانے سے ربڑ بہترین مائع کی شکل میں تبدیل ہو جاتا

ہے۔ اس طریقے سے ہنکاک نے اپنے کاروبار کو ترقی دی اور کئی ربڑ کی اشیا بازار میں پیش کیں۔ ہنکاک کے اس طریقے کا علم غالباً میکن ٹاش کو ہو چکا تھا۔ ہنکاک نے اس میں عافیت دیکھی کہ میکن ٹاش کے ساتھ کاروباری رفاقت اور اشتراکِ عمل کر لے۔ یہ طریقہ اب ربڑ انڈسٹری میں مروج ہے اور اسے انٹرنل مکسر Internal Mixure کا نام دیا گیا ہے جو برقی طریقے سے خودکار طور پر کام انجام دیتا ہے۔ اس سے خام ربڑ نرم ہو جاتا ہے اور اسے مختلف شکلیں دی جاسکتی ہیں۔

ہنکاک نے 1825 میں ایک مشین پیٹنٹ کروائی۔ اس مشین میں ربڑ کے رقیق محلول اور کپڑے کو دو بیلنوں (Rolls) کے درمیان سے گزار کر کپڑے کو واٹر پروف بنایا جاتا تھا۔ اس مشین اور ایک دوسری Basic Processing مشین کی کارکردگی کو 1836 میں ایک امریکی سائنس داں ایڈورڈ ایم شافر (Edward M Chaffer) نے بہتر بنایا اور شہرت دی۔

بہر حال انیسویں صدی عیسوی میں ہی ربڑ کو قبولِ عام حاصل ہو گیا اور ربڑ سے بنی ہوئی بے شمار اشیا بازار میں دستیاب ہونے لگیں مگر ایک بات تھی کہ ربڑ کی کچھ اشیا سخت سرد موسم ہی میں اور کچھ اشیا کسی قدر گرم موسم ہی میں تیار کی جاسکتی تھیں۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ گرم موسم میں تیار کی جانے والی اشیا سخت سرد موسم میں تیار کی جاسکیں اس کے علاوہ اس ربڑ میں چپ چپا پن بھی ہوتا تھا۔

ربڑ کی صنعت سے وابستہ چارلس گڈایر (Charless Good Year) نے 1839 میں ثابت کیا کہ ربڑ کو گندھک (Sulphur) کے ساتھ گرم کیا جائے تو ربڑ کی قوت Strength اور لچکداری (Elasticity) میں زبردست اضافہ ہوتا ہے۔ اس محلول کے ٹھنڈا ہونے پر سرد موسم میں یہ نہ تو دوبارہ سخت ہوتا ہے اور نہ گرم کرنے پر نرم ہوتا ہے۔ اس طریقے کو سائنسدانوں نے والکنیز نگ نام دیا ہے۔ (عبدالحق صاحب کی اسٹینڈرز انگلش اردو ڈکشنری میں والکنیز نگ کا ترجمہ ولکانہ دیا گیا ہے۔ ولکانہ کے آگے درج ہے ربڑ کو سخت نہ کرنا مگر لفظ والکنیز نگ کا اب اردو میں چلن عام ہو گیا ہے آگے ہم اسی لفظ کو استعمال کریں گے۔)

گڈایر کے تجربات سے بے خبر، اسی زمانے میں انگلینڈ میں ہنکاک نے بھی والکنیز نگ کا طریقہ دریافت کیا اور دونوں ہی نے سخت اور خام ربڑ کے گوندھنے (Kneding) کا طریقہ اختراع کیا جس میں گندھک اور دوسرے پاؤڈر شامل کیے جاتے تھے جس سے ربڑ نرم ہو جاتا تھا۔ یہی طریقہ ربڑ انڈسٹری کے ڈیولپمنٹ کا نقطۂ آغاز ہے۔

1846 میں والکنیز نگ کے ذریعے تیار کی گئی ربڑ پٹیوں (Stripes) کو کاربن ڈائی سلفائیڈ کے محلول میں سے گزارنے کا تجربہ کیا گیا جس سے اس محلول کو گرم کیے بغیر مطلوبہ معیار کی شے حاصل کی گئی۔

والکنیز نگ کی ایجاد کے بعد ربڑ کا استعمال بے انتہا بڑھ گیا خام ربڑ کی طلب میں بے انتہا اضافے سے جنگلات سے حاصل ہونے والے خام ربڑ کی رسد میں کمی محسوس ہونے لگی۔ جنگل کے درختوں کے ربڑ کی سپلائی میں اس وقت برازیل (جنوبی امریکہ) کو اجارہ داری حاصل تھی۔ برازیل کے ساحلی شہر پانا (Pana) سے ایکسپورٹ ہونے والا خام ربڑ اپنی کوالٹی میں سب سے اعلیٰ مانا جاتا تھا اور منہ مانگے دام پاتا تھا۔ ان دنوں جنوبی امریکہ کے جنگلوں میں ربڑ حاصل کرنے کے لیے Slaughtered Tapped طریقہ استعمال کیا جاتا تھا تاکہ درخت سے زیادہ سے زیادہ ربڑ حاصل ہو، قطع نظر اس کے کہ درختوں پر کیا گزرتی ہے اور ان کا کیا حال ہوتا ہے۔ جنوبی امریکہ کے دریائے امیزن (Amazon) کے دونوں کناروں پر بسنے والے ریڈ انڈین قبائلیوں کا ان دنوں یہی پیشہ بن گیا تھا کہ جنگل کے درختوں کا Slaughter Tapped کریں اور ان سے زیادہ سے زیادہ ربر حاصل کریں۔ اس کو ساحلی شہروں تک پہنچائیں اور وہاں سے دنیا بھر کو ایکسپورٹ کریں۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک یہی ربڑ یا Latex ساری دنیا کو فراہم کیا جاتا رہا اور دوسری طرف ربڑ کے درخت تباہ ہوتے رہے۔ ایسی صورت میں ربڑ کے درختوں کی کاشت اور شجرکاری ناگزیر تھی۔

یہ ہندوستان کی برطانوی حکومت تھی جسے خیال آیا کہ ربڑ کے جنگلی درختوں کی ایشیا میں بڑے پیمانے پر شجرکاری کرے۔ ایک برطانوی جہاز راں اور مہم جو ہنری وکہام (Henry Wickham) نے 1876 میں برازیل کے جنگلوں میں ربڑ کے درختوں کی ایک نوع (Heavea Braziliances) کے ستر ہزار (70,000) بیج (Seeds) جمع کیے اور اسمگل کرتے ہوئے برطانیہ کے ڈائرکٹر آف بوٹانیکل گارڈنز کو کیو (Kew)، لندن کے مضافات میں واقع ایک مقام پر حوالے کیے ان کی فوری طور پر کیو کے بوٹانیکل گارڈن اور جنگل میں کاشت کر دی گئی اور ان کی باقاعدہ نگہداشت اور آبیاری کی گئی۔ انتھک کوششوں کے بعد ان میں سے دو ہزار چھ سو (2600) یعنی چار فی صد (4%) بیج اُگنے لگے اور بارآور ہوئے۔ ان میں سے اڑتیس انتہائی احتیاط کے ساتھ سیلون (سری لنکا، جو اس زمانے میں برطانوی ہند ہی کا حصہ تھا) کے حوالے کیے گئے اور جون 1877 میں کیو سے ہی بائیس پودے سنگاپور (یہ بھی برطانوی حکومت کا حصہ تھا) کے حوالے کیے گئے۔ ان کا دو تہائی حصہ یعنی صرف چودہ پودے وہاں سرسبز اور ثمر آور ہوئے اور یہی چودہ درخت بعد میں ساری دنیا کے ربڑ کے زیرِ کاشت Cultivated درختوں کی بنیادی اکائی بنے اور صدی کے اواخر تک Cultivate درختوں سے حاصل ہونے والے بیجوں سے بڑے

پیانے پر سیلون اور ملایا (اب ملیشیا کا حصہ) اور کچھ عرصے بعد انڈونیشیا اور برطانوی ہند میں شجرکاری کی گئی۔ یہ بوئے گئے درخت سات سال بعد اس قابل ہوگئے کہ ان سے Latex رسنے لگے۔ اس دوران اس خام ربڑ کی طلب بھی بڑھنے لگی اور اس کی قیمت میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ 1910 میں خام ربڑ کی قیمت 7.05 ڈالر فی کیلو تھی۔

1898 تک ربڑ کے درختوں کی کاشت پر لوگ ہنسا کرتے تھے۔ بارہ برس بعد ہی 1910 میں ان درختوں سے ربڑ حاصل ہونے لگا تو دنیا بھر میں ان کی شجرکاری اور مزرعے (Forms) بنانے کی لہر پیدا ہوگئی۔ ربڑ کے درختوں کی شجرکاری، مزرعوں کا قیام، بیجوں کی تقسیم، بیجوں اور درختوں کی حفاظت، بیماریوں سے تحفظ اور رساؤ کے موزوں اور مناسب طریقوں کے ارتقا کے لیے ایچ ڈبلیو رڈلے (H.W. Ridley) کی جگرکاوی اور محنت شاقہ کو بھلایا نہ جاسکے گا۔ ابتدا میں تو لوگ اسے پاگل رڈلے کے نام سے پکارتے تھے۔

1845 میں آر ڈبلیو تھامپسن (R.W. Thompson) نے ایک ایجاد پیٹنٹ کروائی۔ یہ ایجاد تھی ربڑ کا ایک نرم ٹیوب جس میں ہوا بھری جاسکتی تھی اور سخت ربڑ سے اس ٹیوب کو ڈھانپنے والا کور (Cover) جسے ٹائر کا نام دیا گیا۔ مگر اس ایجاد کو اس وقت قبول عام حاصل نہ ہوسکا کیونکہ یہ کسی تیز رفتار سواری میں استعمال کے قابل نہ تھا۔

1888 میں جے بی ڈنلپ (J.B. Dunlop) نے اپنے بیٹے کے استعمال کے لیے آہنی نالیوں اور آہنی پٹیوں کی مدد سے ایک گاڑی بنائی اور آہنی پٹیوں ہی کی مدد سے اس کے پہیے بنائے۔ اس گاڑی کو اس نے بائیسکل نام دیا۔ بائیسکل کے پہیوں کو آرام دہ بنانے کے لیے ہوا بھرے جانے والے ٹیوب اور ان کو ڈھانپنے والے ٹائر بنائے۔ ڈنلپ کو قطعاً علم نہ تھا کہ ایسے ٹیوب اور ٹائرتیں پینتیس سال پہلے ہی تیار ہوکر پیٹنٹ ہوچکے ہیں مگر اس کی ایجاد کا پُر افادیت اور منفعت بخش پہلو یہ تھا کہ یہ ٹیوب اور ٹائر تیز رفتار سواری میں بھی استعمال ہوسکتے تھے۔ چنانچہ یہ ہوا بھرے جانے والے (Pneumatic) ٹیوب اور ٹائر بے انتہا مقبول ہوئے۔

1916 میں ٹائروں کو مضبوط بنانے کے لیے مضبوط کپاس کے دھاگے استعمال ہونے لگے۔ جلد ہی ان کا استعمال متروک ہوگیا ان کی جگہ مضبوط بُنائی والے پارچے استعمال ہونے لگے۔ اس سے پہلے 1914 میں کاربن کے مرکبات ربڑ کو مقوی بنانے کے لیے استعمال ہونے لگے تھے۔

اسی دوران Internal Combustion انجن کی ایجاد ہوئی اور اس کی بنیاد سے ابھرنے والی دیگر ایجادات نے سواری گاڑیوں کے ارتقا میں ناقابل قیاس حد تک ترقی کی۔ سواری گاڑیاں بائیسکل اور گھوڑا گاڑیوں سے آگے بڑھ کر موٹر سائیکل موٹر کار، سامان ڈھونے والے ٹرک، جیپ اور بکتر بند گاڑیاں ٹریکٹر سے آگے ہوائی جہاز جو معمولی دو نشستی طیاروں سے بڑھ کر اب جیٹ جمبو جیٹ، سوپر سونک ہیں حتیٰ کہ طیاروں میں بھی دیوہیکل سامان ڈھونے والے طیارے ہیں۔ ان سب سواری گاڑیوں اور نقل وحمل کی گاڑیوں کے لیے نیوماٹک ٹائر ان کا جزو لاینفک یا اٹوٹ حصہ ہیں۔

سواری اور نقل وحمل کی گاڑیوں میں جو تیز رفتار انقلابی تبدیلیاں ہورہی ہیں انھوں نے بھی اب سے سو، سوا سو برس پہلے ڈنلپ کے بنائے ہوئے سائیکل کے سادہ ربر ٹائروں میں بھی ہر زاویے سے انقلابی تبدیلی پیدا کردی ہے۔ پہلے ٹائروں میں کپاس کے دھاگے استعمال ہوتے تھے، پھر مضبوط بُنائی والے پارچے استعمال ہونے لگے۔ اب ریان، نائلان، پالی ایسٹر، گلاس فائبر اور ارامائیڈ فائبر استعمال ہونے لگے ہیں ربڑ ٹائروں میں ایک اور انقلابی تبدیلی بغیر ٹیوب کے (Tubeless) نیومیاٹک ٹائر کی ایجاد ہے۔

تمام گاڑیاں جن میں رب ٹیوب یا بغیر ٹیوب والے ربڑ کے ٹائر استعمال ہوتے ہیں ان کی بنانے والی فیکٹریوں اور ان میں مامور ربڑ ٹیکنالوجیوں (یا ماہرین ربڑ سازی) نے اپنے اپنے فارمولے وضع کیے ہیں۔ آج کا ٹائر ربڑ، کیمکلز ٹکسٹائل اور دھاتوں کا خوبصورت امتزاج ہے جس کی وجہ سے ربڑ ٹیکنالوجی اب نام ہے انجینئرنگ، فزیکل سائنس، ٹکسٹائل ٹیکنالوجی اور آرٹ کے مرکب کا۔

ٹائر سڑکوں پر چلیں یا ہوا میں چلیں ان کو بازار میں چلانے کے لیے ربڑ ٹیکنالوجسٹ کو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اس کے ٹائر دیرپا ہوں، ان میں تحفظ ہو، ان کے چلنے میں ماحول اور سڑکوں کی سطح میں مزاحمت (Resistance) کم ہو، سڑکوں پر چاہے وہ خشک ہوں یا بھیگی ہوئی بہتر پکڑ (Grip) ہو اور یہ ٹائر تیز رفتاری پر بھی قابو میں ہوں

ربڑ ٹیکنالوجی کے مختلف مدارج میں ارتقا نے سرمایہ کاروں کو زیادہ سے زیادہ منفعت کے حصول کے لیے مجبور کیا کہ وہ اپنی مصنوعات کی زیادہ سے زیادہ مقدار کی تیز ترین تیاری کے لیے بہتر آلے اور مشینیں تیار اور استعمال کریں تاکہ ان کی مصنوعات میں یکسانیت ہو، ان کی کوالٹی بہتر ہو اور کارکردگی کم۔ چنانچہ دو بیلنوں والے اور سادہ اسطوانوں کے حامل پرانے ورکشاپوں کی جگہ انٹر مکسر، بامبری (Bombury) اور انٹر مکس فیکٹریاں بن گئی ہیں۔ آج کے مکسر خاص کنٹرول کے حامل ہیں جن میں نئے ڈھنگ کے Rotor (مشینوں کا گردش کرنے والا حصہ) ہوتے ہیں ان میں انفرا ریڈ حرارت پیما، خاص قسم کی

موگریاں اور کوٹنے کے آلات نصب ہیں۔ ان میں چار چار Extruder لگے ہوئے ہیں جو پگھلے ہوئے مائع کو مختلف مدارج پر خارج کرتے ہیں۔

سواری گاڑیوں کی ترقی کے مدارج میں نیومیاٹک ٹائروں کی ایجاد نے خام ربڑ کی طلب میں قوت محرکہ کا کام دیا اور اس کی زبردست طلب کے باوجود بھی 1910 تک بھی نیچرل ربڑ کی سپلائی میں کمی نہ رہی اور شجرکاری نے خام ربڑ کی کمی کو محسوس نہ ہونے دیا بلکہ جنگلاتی ربڑ پر انحصار کو کم کر دیا۔ اگر چہ تالیفی ربڑ (Synthetic Rubber) 1826 میں تیار کرلیا گیا تھا مگر اس کی تجارتی پیمانے پر تیاری کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ پہلی جنگ عظیم 1914 کے دوران جرمنی کے پاس نہ تو ربڑ کے جنگلاتی علاقے تھے اور نہ کاشت شدہ ربڑ کے فارم اس لیے اسے تالیفی ربڑ پیدا کرنا پڑا مگر اس کی مقدار بھی صرف چند ہزار ٹن ہی رہی۔ پچھلی چند دہائیوں سے ربڑ کی زبردست طلب پر تالیفی ربڑ کی تجارتی پیمانے پر تیاری کی طرف توجہ دینا پڑی۔ تالیفی ربڑ میں صرف تیس فی صد (30%) نیچرل ربڑ ہوتا ہے بقیہ ستر فی صد 70% حصہ کاربن بلیک، دوسرے پاوڈرس اور کیمیکلز پر مشتمل ہوتا ہے مگر یہ اصل ربڑ سے زیادہ مضبوط، پائدار اور سستا ہوتا ہے۔

□□□

پتہ:
49/2RT, Vijaynagar Colony,
Hyderabad-500057

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

"فکر و تحقیق"

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نا معلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

تازہ شمارہ (اپریل، مئی، جون 2008) **مخدوم محی الدین نمبر** شائع ہوچکا ہے۔

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

زرسالانہ بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں۔

دہلی سے باہر کے خریدار صرف ڈرافٹ یا منی آرڈر ہی ارسال کریں۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	سادہ ڈاک آرڈینری	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	316 روپے
نیپال	160 روپے	228 روپے	292 روپے	360 روپے
بنگلہ دیش	146 روپے	174 روپے	238 روپے	306 روپے
دیگر ممالک	160 روپے	220 روپے	336 روپے	396 روپے

علی معصوم رضا

کال سینٹرز میں کیریئر

کال سنٹر کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ ایک ایسا ادارہ جہاں پر کسی مخصوص کمپنی کے گاہکوں (Customers) کو انٹرنیٹ کی مدد سے سہولتیں پیش کی جاتی ہوں۔ کال سنٹر کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

(1) Voice Based

(2) Non Voice Based

(1) وائس بیسڈ کال سنٹرز پر گاہکوں کو فون کی مدد سے خدمات پیش کی جاتی ہیں، ان کو آن لائن کال سنٹرز بھی کہا جاتا ہے۔ کمپنی اپنے گاہکوں کو ایک مخصوص Toll Free فون نمبر دیتی ہے، جس کے ذریعے وہ ان کال سنٹرز سے رابطہ پیدا کرتے ہیں اور کئی مسائل فون ہی کے ذریعے حل کیے جاتے ہیں۔ ان کال سنٹرز میں انداز گفتگو اور قواعد کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ انٹرنیشنل کال سنٹر کے لیے انگریزی زبان پر عبور کے علاوہ انداز گفتگو اور لہجے سے بھی واقفیت ضروری ہوتی ہے۔

(2) نون وائس بیسڈ کال سینٹرز پر گاہک کو ای میل یا پھر Chatting کے ذریعے خدمات پیش کی جاتی ہیں۔ انھیں Web based call centres بھی کہا جاتا ہے۔ گاہکوں کے مسائل کو ای میل یا پھر آن لائن چیٹنگ کے ذریعے حل کیا جاتا ہے۔

(1) Technical Support

(2) Non Technical Support

ٹیکنیکل سپورٹ: ٹیکنیکل سنٹرز میں صرف ٹیکنیکل مسائل کو حل کرنے کی گنجائش فراہم کی جاتی ہے۔ یہ خدمات Voice Based بھی ہوسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر Device Support, Software Application Support, Computer Hardware Support ایسی کئی ٹیکنیکل خدمات ہیں جو اس زمرے میں شامل کی جاسکتی ہیں۔ ان خدمات کا ایک بڑا حصہ کمپیوٹر ہی کے اردگرد گھومتا ہے، یہ خدمات بالواسطہ یا پھر بلاواسطہ کمپیوٹر ہی سے جڑی ہوتی ہیں۔

نان ٹیکنیکل سپورٹ: ان سنٹرز میں Non-Tech مسائل کو حل کرنے کی گنجائش فراہم کی گئی ہے۔ ان سنٹرز کی خدمات میں انشورنس، اکاؤنٹس، بینکنگ، اطلاعات کی فراہمی جیسے کئی اہم معاملات کو شامل کیا جاسکتا ہے جو سنٹرز کمپنی کی آمدنی بڑھانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں اور کمپنی اس شعبے پر خاص توجہ بھی دیتی ہے۔

کال سنٹرز کی خصوصیت یہ ہے کہ دن کے چوبیس گھنٹے، ہفتے کے سات دن اور سال کے 365 دن یہ اپنی خدمات انجام دیتے ہیں۔ کال سنٹرز میں مختلف شفٹس کا نظام رائج ہے جس کی وجہ سے یہ اپنی خدمات دن کے چوبیس گھنٹے بلاوقفہ انجام دیتے ہیں۔

ہندوستان میں کال سنٹرز:

ہندوستان میں کال سنٹرز کی بنیاد GE کمپنی نے ڈالی جب اس نے اپنا پہلا سنٹر دہلی میں قائم کیا، جس کے بعد ان سنٹرز کے قیام کے لیے حکومت نے بھی خاص توجہ دی اور کئی بین الاقوامی کمپنیوں نے اپنے خوابوں کی تعبیر ہندوستان میں ڈھونڈنی شروع کی اور ان اداروں نے کامیابی کے ساتھ حاصل بھی کیے۔ بین الاقوامی معیار کی خدمات کے لیے کئی ملٹی نیشنل کمپنیوں نے کال سنٹر ہندوستان میں قائم کیے۔ اس کی بڑی وجہ ہندوستان کا آئی ٹی انڈسٹری میں سرفہرست مقام، امریکا کے بعد انگریزی زبان کو استعمال کرنے والے افراد کی تعداد، ممبئی شعبے میں تنخواہوں کی کم شرح، حکومت کی جانب سے ان خدمات کے فروغ کے لیے کیے جانے والے اقدامات ہیں۔ ہندوستان میں دہلی، بنگلور اور چنئی کے بعد حیدرآباد میں کال سنٹرز کی افراط نے یہ ثابت کردیا ہے۔ یہ شعبہ مسلسل ترقی کرتا ہے اور اس میں باصلاحیت لوگوں کی کھپت کی بہت گنجائش ہے۔ Nasscom Mackinsey Report کے مطابق اس انڈسٹری کا سرمایہ 2008 میں صرف ہندوستان ہی میں 17 بلین ڈالر تک پہنچ جائے گا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس انڈسٹری کو کتنے پروفیشنلس درکار ہوں گے۔

1990 کے دہے پہ اگر ہم نظر ڈالیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ نجی ملازمتوں میں تنخواہوں کی صورت حال کیا تھی۔ ہر نوجوان جو گریجویٹ یا پھر پوسٹ گریجویٹ ہوتا وہ یہی چاہتا کہ اسے سرکاری ملازمت مل جائے جس میں تنخواہ کی گارنٹی ہو اور تنخواہ کی شرح بھی کچھ بہتر ہو لیکن کال سنٹر اور ان جیسی دوسری انڈسٹریوں کے قیام نے نجی شعبے میں تنخواہوں کی شرح کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ کال سنٹر انڈسٹری میں تنخواہیں 7 یا 8 ہزار سے شروع ہوتی ہیں اور تجربے کے لحاظ سے اپنی حد مقرر کرتی ہیں۔ حکومت کی جانب سے بھی کئی اقدامات کیے جارہے ہیں جن کی وجہ سے یہ ممکن ہوسکا ہے کہ بین الاقوامی معیار کی کمپنیاں ہندوستان خاص کر سرزمین حیدرآباد کو پسند کررہی ہیں تاکہ یہاں پر عصری معیار

کے اپنے کال سنٹر قائم کریں۔ کال سنٹر اپنے ملازمین کو جو سہولتیں مہیا کرتے ہیں ان میں پراویڈنٹ فنڈ، گریجویٹی، گروپ میڈیکلیم انشورنس اسکیم، پرسنل ایکسیڈنٹ انشورنس اسکیم، فوڈ اینڈ ٹرانسپورٹیشن، کمپنی لیزڈ اکاموڈیشن، ATM، کارپوریٹ کریڈٹ کارڈ، سیلولر فون، لیپ ٹاپس، لونس، Educational Benefits اور Performance based incentives وغیرہ شامل ہیں۔ ان سہولتوں کا اطلاق ہر کمپنی کی پالیسی کے تحت ہوتا ہے۔ کال سنٹر جب اپنے ملازمین کو اتنی ساری سہولتیں بہم پہنچاتے ہیں تو ان ملازمین سے یہ امید بھی رکھتے ہیں کہ وہ ان کی کسوٹی پر پورے اتریں۔ ملازمین اپنی کمپنی کے لیے گھاٹے کا سودا نہیں بلکہ نفع بخش ثابت ہوں اور اس کا اندازہ گاہکوں کی طرف سے آنے والے ردعمل سے ہوتا ہے جن میں یا تو ان ملازمین کے طرز عمل کی ستائش کی جاتی ہے یا پھر ان کی خدمات کو بہتر بنانے کے لیے مشورے دیے جاتے ہیں۔ آج جب کہ اقلیتیں حکومت سے تحفظات کی خواہاں ہیں اور یہ مطالبہ کیا جارہا ہے کہ نہ صرف تعلیمی اداروں میں بلکہ ملازمتوں میں بھی پانچ فیصد تحفظ دیا جائے تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ حکومت اقلیتوں کو کس کھلونے سے خوش کرتی ہے لیکن اس وقت قابل اقلیتی گریجویٹس یا پوسٹ گریجویٹس اگر اس انڈسٹری سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی عصری تعلیم اور تجربہ بھی حاصل کرتے ہیں تو یہ ایک نعمت سے کم نہ ہوگا۔ یہ صحیح وقت ہے کہ اقلیتی تعلیم یافتہ نوجوان اس انڈسٹری کے ساتھ اپنے کیریئر کو وابستہ کرلیں۔ مستقبل میں یہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ایک لہر ثابت ہوگی جو بھی اس لہر میں پہلے آئے گا وہ زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرے گا۔ ☐☐☐

پتہ:
C/o Dr. Md. Zahid,
1114, Ganjmeer Khan,
Behind Delite Cinema,
Darya Ganj, New Delhi-110002

نشاطِ روح

شاعر: اصغر گونڈوی

اصغر گونڈوی کے مجموعۂ کلام ''نشاطِ روح'' (مرتب: مرزا احسان احمد) کی پہلی اشاعت 1925 میں مطبع معارف اعظم گڑھ سے اور دوسری اشاعت (مرتب: اقبال احمد سہیل) 1982 میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے عمل میں آئی تھی۔ اقبال احمد سہیل نے اس مجموعے کو بڑی دیدہ ریزی سے مرتب کیا ہے۔ مرزا احسان احمد کے دیباچے اور مقدمے کے بعد انھوں نے ''تبصرہ'' کے عنوان سے اصغر گونڈوی کی شاعری کا مبسوط محاکمہ کیا ہے اور ان کی شاعری کے محاسن کو موسیقی، بت تراشی، ایجاد و تخلیق، مصوری اور اسرار و معارف کے الگ الگ عنوانات سے سمجھنے کی کوشش کے بعد آخر میں اصغر گونڈوی کا کلام شامل کیا ہے۔ اصغر گونڈوی کی غزلوں کی ہمہ گیری اور اثر انگیزی کے مطالعے کے لیے اس نسخے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 73، قیمت: -/49 روپے

ڈیوڈ کاپرفیلڈ (جلد اول)

مصنف: چارلس ڈکنس/ مترجم: فضلِ حسنین

چارلس ڈکنس کی تحریر کی دلربائی اور اس کے اسلوب کی رعنائی کو اپنے ترجمے میں کشید کرنے میں فاضل مترجم نے کتنا وقت صرف کیا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس ترجمے کی ہر سطر میں پھولوں کی وہی خوشبو بسی ہوئی ہے جس سے چارلس ڈکنس کی انشاپردازی کا چمنستان مہکتا تھا۔

اسے ترجمہ نہیں، اصل ناول کا عکسِ جمیل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ڈیڑھ سو برس قبل انگریزی میں لکھے گئے اس شہرۂ آفاق ناول کا پہلی مرتبہ اردو ترجمہ پیش کرنے کا شرف ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کو حاصل ہے۔

صفحات: 516، قیمت: -/256 روپے

محمد شاہد حسین

(ہماری مطبوعات سے)

عوامی ڈرامائی روایات

رام لیلا: رام لیلا عام طور سے رامائن سے ماخوذ ہوتی ہے اور اس میں رام چندر جی کے بن باس جانے اور سیتاجی کی داستان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس میں پیشہ ور ایکٹروں کی جگہ چھوٹے چھوٹے بچے رام، لچھمن اور سیتاجی کی شکلیں بنا کر ان کی زندگی کے حالات پیش کرتے ہیں۔

یہ کھیل خاص طور سے دسہرے کے تیوہار کے لیے مخصوص ہے اس موقعے پر جگہ جگہ اس کی نمائش ہوتی ہے۔ اس کی پیش کش کا طریقہ یہ تھا کہ بغیر کسی پس منظر کے زمین پر دری بچھا دی جاتی تھی جسے اسٹیج تصور کرلیا جاتا تھا۔ سارے اداکار بیک وقت اسٹیج پر موجود ہوتے تھے اور اداکاروں کے لباس تبدیل کرنے اور میک اپ کرنے کے لیے ایک کپڑا تان کر آڑ کردی جاتی تھی۔ اکثر اداکار پارٹ کرتے ہوئے رک کر حقہ کا کش لگا لیتے، اسٹیج پر داڑھی مونچھیں تبدیل کرلیتے یا مونچھوں کے ساتھ ہی زنانہ پارٹ ادا کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ مرے ہوئے کردار خود ہی اٹھ کر سامنے سے چلے جاتے تھے۔ ان سب باتوں کی اس وقت کوئی پروانہیں کرتا تھا۔ منظر بدلنے اور مقام بدلنے کی اطلاع خود اداکار کہہ کر دیتا تھا۔ اس میں گانے اور موسیقی کا بھی استعمال ہوتا تھا۔

بن باس کے دوران سیتاجی کو راون کا لے جانا، رام چندر جی کا لنکا جانا، سیتاجی کو واپس لانا، رام لیلا میں یہ اور اسی قسم کے کچھ اور مناظر جلوس کی شکل میں دکھائے جاتے ہیں۔ اس میں جنگ کے مناظر کھلے میدان میں پیش کیے جاتے ہیں۔

گوکہ اس کی ڈرامائی حیثیت کے مقابلے میں مذہبی حیثیت زیادہ ہے۔ پھر بھی روپ بھرنا، مختلف اشخاص کی شکلیں بنانا، ایک قصے کو تمثیلی انداز میں پیش کرنا اسے خاموش تمثیل اور ''مریکل پلے'' کے درجے تک پہنچا دیتا ہے۔

بنگالی میں اس قسم کی نمائشوں کو ''جاترا'' کہا جاتا ہے۔ شروع شروع میں ''جاترا'' میں خالص مذہبی نمائشیں ہوتی تھیں لیکن دھیرے دھیرے اس میں سماجی نمائشیں بھی شامل ہوگئیں اور ''جاترا'' کی مناسبت سے اس قسم کا کھیل کھیلنے والی منڈلیوں کو بھی ''جاترا'' کہا جانے لگا۔

راس لیلا: ہندوستان میں جنم اشٹمی یعنی کرشن جی کے جنم دن کے موقعے پر ان کے حالات زندگی سے منتخب واقعات کی تمثیل کی شکل میں نمائش کی جاتی ہے۔

یہ نمائش ''راس لیلا'' یا ''کرشن لیلا'' کہلاتی ہے۔ بعد میں اسے ''رہس'' کہا جانے لگا اور اس کے کھیلنے والوں کو ''رہس دھاری''۔ رفتہ رفتہ اس کے ساتھ جنم اشٹمی کی شرط ختم ہوگئی اور یہ ان میلوں میں بھی دکھائی جانے لگی جو سال کے مختلف حصوں میں منعقد ہوتے رہتے تھے۔ میلوں کے علاوہ لوگوں کے یہاں اجرت پر بھی رہس دھاری منڈلیاں رہس کھیلنے جایا کرتی تھیں۔

ابتدا میں رہس کرشن جی کے حالات زندگی تک محدود ہوتے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ تبدیلی آئی کہ کرشن کی لیلاؤں میں سے کوئی لیلا، مثلاً کالی ناگ لیلا، ماکھن چوری، چیر ہرن، کنس مردن، منھیارن لیلا، ڈھاری لیلا دکھا کر رسم پوری کردی اور پھر مشہور قسم کے مذہبی یا غیر مذہبی قصوں میں سے کسی قصے کو پیش کیا۔ جیسے ہریش چندر، مکردھوج، پرہلاد، دھرو، دیا رام گوجر یا سیاہ پوش کا قصہ۔

راس لیلا کی پیش کش میں ناچ گانوں کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ گوکہ اس میں کرشن جی کے عاشقانہ واقعات سے متعلق گانوں کو ضرور شامل کیا جاتا ہے پھر عام رہسوں میں ہر مصنف اپنی اپنی پسند اور مذاق کے گانے بھی شامل کرلیتا تھا۔

ایسے کھیلوں کو کبھی جلوس کی شکل میں پیش کیا جاتا اور کبھی کھلے میدانوں، سڑکوں اور بازاروں میں اسٹیج بنا کر۔ اس کا اسٹیج یوں بنایا جاتا تھا کہ آس پاس سے کچھ تخت اکٹھا کرکے انھیں آپس میں ملا کر ایک قدرے اونچی اور ہموار سطح بنالی جاتی جس پر حسب ضرورت دریاں بچھا دی جاتیں۔ اس کے کرداروں کو اس چوکے کے ایک کونے پر بیٹھا دیا جاتا جو اپنی اپنی باری پر اٹھ کر اپنا اپنا پارٹ ادا کرکے بیٹھ جاتے۔ گانوں کے علاوہ اس میں مکالمے بھی نظم میں ہوتے تھے اور ایک شخص (جسے راوی سمجھنا چاہیے) کردار کے سامنے آنے سے پہلے اس کا مختصر تعارف بھی کرادیتا تھا۔[1]

ان چیزوں کی ڈرامائی حیثیت کے بارے میں محمد اسلم قریشی لکھتے ہیں:

''اندر سبھا کی روایت'' سے ماخوذ، مصنف: محمد شاہد حسین / صفحات 344، قیمت: -/140

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔
ادارہ

"برعظیم پاکستان و ہند میں ان مذہبی رسومات پر پیش ہونے والی چیزوں بالخصوص لیلاؤں کی پیش کش کی نوعیت اور اردو ڈرامے کی تاریخ میں ان کی حیثیت وہی ہے جو جرمن برامرگو Oberammergue کی تھی جس میں مقررہ اوقات پر حضرت مسیح کے حالات زندگی کو پیش کیا جاتا تھا یا جو نوعیت انگریزی ادب میں میریکل Miracle اور مسٹری Mystry ڈراموں کی رہی ہے۔"(2)

بھنڈیتی یا نقالی: ہندوستان میں نقل کا رواج قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ بھانڈ (جسے نقال بھی کہتے ہیں) نہ صرف بہروپ بھرتے ہیں اور نہ داستان گو کی طرح صرف بیان سے کام لیتے ہیں بلکہ وہ بہروپ بھر کر بیان اور اداکاری کے ذریعے کسی واقعے کو عملاً پیش بھی کرتے ہیں۔ اسے انگریزی میں Farce "فارس" اور ہندی میں "پرہسن" کہتے ہیں۔ اکثر نقلوں میں صرف ایک اور کبھی کبھی دو یا تین ڈرامائی سین ہوتے ہیں جسے کئی آدمی مل کر پیش کرتے ہیں۔ بھانڈوں کی نقلیں چھوٹے چھوٹے چٹنے ہنسانے والے کھیل تماشے ہوتے ہیں اور ان میں پیش کردہ واقعات ایسے نہیں ہوتے جن میں باقاعدہ تسلسل، آغاز، درمیان اور انجام مربوط طور پر موجود ہو۔ پھر بھی یہ ڈرامے اور ایکٹنگ کے نقطۂ نظر سے بہروپ سے بہتر پیش کش ہے۔

بھگت بازی: پرانے قصوں اور مثنویوں میں بھانڈوں کے ساتھ ساتھ بھگت بازوں کا بھی ذکر آیا ہے۔ "فرہنگ آصفیہ" میں بھگت کے معنی یہ بتائے گئے ہیں "ہندوؤں کا ایک مذہبی سوانگ جس میں نرسنگھ اوتار اور کرشن وغیرہ کا روپ بھرتے ہیں۔" اسی فرہنگ میں "بھگت باز" کے یہ معنی بھی لکھے ہیں:

"ہندوؤں کا وہ فرقہ جو لڑکوں کو نچاتا اور سوانگ وغیرہ بھر کر تماشا دکھاتا ہے۔"

بھگت بازوں کے سلسلے میں سب سے قدیم بیان پنجاب کے مشہور شاعر مولانا محمد اکرم کی مثنوی "نیرنگ عشق" میں ملتا ہے جو 1096ھ میں تصنیف ہوئی۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ بھگت باز موسیقی، رقص اور نقل میں مہارت رکھتے اور طرح طرح کے روپ بھر کر ہر طبقے کے لوگوں کی نقل کرتے تھے۔

"نقالوں یا بھانڈوں کا کام زبان سے نقلیں یا لطیفے بیان کرنا تھا اور بھگت بازوں کا کام کسی کا بھیس بنا کے ان کے افعال و حرکات کی تمثیل پیش کرنا تھا۔ ناچ گانا دونوں میں مشترک تھا۔ بعد کو یہ فرق باقی نہ رہا۔ نقالی اور بھگت بازی ایک دوسرے میں مدغم ہوگئیں اور بھگتیا و بھگت باز کے الفاظ رفتہ رفتہ متروک ہوگئے۔"(3)

ان نقالوں میں زنانہ کردار اکثر خوش رو لڑکے ادا کرتے جنھیں بچپن سے ناچ گانے کی تعلیم دی جاتی اور ان کی لمبی لمبی چوٹیاں رکھی جاتیں۔ نقالوں اور بھانڈوں کے طائفے عام طور سے بہروپ بھرنے اور اداکاری میں بڑے ماہر ہوتے تھے کیوں کہ وہ جس کی بھی نقل اتارتے اس کے رنگ روپ کپڑے وغیرہ کے علاوہ چال ڈھال بات چیت کرنے کے انداز اور ہر قسم کے جذبات کا اظہار ہو بہو کرتے اور یہ کام بغیر اداکاری کی مہارت کے ممکن نہیں۔

یہ برمحل اور برجستہ مکالمے ادا کرنے میں بے مثل ہوتے تھے۔ ان کے سارے مکالمے فی البدیہہ ہوتے تھے لیکن موقع اور محل کے اعتبار سے بالکل موزوں۔ اگر چہ ان کی پیش کردہ چیزوں میں کوئی مسلسل کہانی قصہ یا پلاٹ نہ ہوتا تھا تاہم من گھڑت واقعات کے مختلف ٹکڑوں کو ڈرامائی انداز میں پیش کرتے تھے۔

بھانڈوں کے شانہ بہ شانہ ڈومنیوں کے طائفے بھی ہوتے تھے، جو زنانہ محفلوں میں اپنے کمالات دکھاتے تھے اور جس طرح بھانڈ زنانہ کردار کے لیے خوبصورت لڑکوں کا انتخاب کرتے تھے ٹھیک اسی طرح ڈومنیاں مردانہ کردار ادا کرنے کے لیے موٹی تگڑی عورتوں کو مقرر کرتی تھیں۔ ان کا اصل کام اگرچہ ناچنا اور گانا بجانا تھا، لیکن یہ ڈومنیاں ان چیزوں کے ساتھ ساتھ نقالی اور بہروپ کا کمال بھی دکھاتیں۔

نقالوں اور ڈومنیوں کی طرح ہجڑوں کا بھی طائفہ ہوتا تھا جو ناچ گانوں کے علاوہ نقل و بہروپ کے مظاہرے بھی کرتے تھے۔ ان کے گانے مردوں اور عورتوں دونوں میں تفریح اور خوش طبعی کا سامان فراہم کرتے تھے۔

بہروپیے: بہروپیے کا کام بھی طرح طرح کے روپ بھر کر نقل کو اصل کے مانند دکھانا ہے۔ یہ فن بھی ہندوستان میں مدت دراز سے رائج ہے۔ مصنفین ناٹک ساگر بہروپیے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ عجیب وغریب ہستی جو مختلف بہروپ بھر کر کوچہ بہ کوچہ چکر لگاتی ہے اور جسے عرف عام میں بہروپیا کہتے ہیں، جرمن ڈراما کی خوشہ چیں ہے کیوں کہ بہروپیا صرف بہروپ بھرنے پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ حرکات و سکنات اور آواز کو بھی کیریکٹر کے مطابق کر دیتا ہے۔ رتن ناتھ سرشار کا "فسانۂ آزاد" میں بہروپیے کا داخل کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ہندوستانی سوسائٹی کا تذکرہ اس کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔"(4)

نقالی بہروپ بھگت بازی اور اسی قسم کی پیش کش کے بارے میں محمد اسلم قریشی لکھتے ہیں:

"نقال اور مسخرے بھی صرف ہندوستانی معاشرے اور یہاں کے درباروں سے مخصوص نہیں تھے بلکہ بارھویں صدی عیسوی میں انگلستان میں ان کا عام شہرہ تھا۔ ملکہ الزابتھ کے زمانے میں یہ امرا کے دربار اور رؤسائے شہر کی مصاحبت اور ملازمت میں رہتے تھے۔ ہندوستانی درباروں میں نقالوں اور

مسخروں کی وہی حیثیت تھی جو برطانوی درباروں میں Clowns کی رہی ہے۔ مزید برآں نقل اور بہروپ بھرنے والی منڈلیاں اسی انداز میں ناٹک پیش کرتی، ہوئی نظر آتی ہیں جس طرح انگلستان میں گھومنے پھرنے والی نقال کمپنیاں جو عہدِ الزابتھ کے ڈرامے کی پیش رو سمجھی جاتی ہیں۔ اس طرح سوانگ، بہروپ اور نقل کی ہندوستان کی ڈرامائی روایت میں وہی حیثیت ہے جو Pageant اور Maygames کی انگریزی ڈرامے کے ارتقا میں ہے۔

Langland کے بیان کے مطابق چودھویں صدی عیسوی میں انگلستان کے معاشرے میں Jester, Tumbler, Jugglur کو نمایاں جگہ دی جاتی تھی۔ ان کی پیش کردہ تفریحی چیزیں عوام کی دلچسپی کی موجب تھیں، ان میں Jester کو خاص اہمیت حاصل تھی جو شیکسپیئر کے عہد تک تفریح طبع کا مرکز بنا رہا اور اس کے ڈراموں میں درباری مسخرے Clown کے روپ میں موجود نظر آتا ہے اور بعض اوقات اپنے مرتبے سے نیچے اتر کر ڈرامے کے دو ایکٹوں کے درمیان مضحک پارٹ ادا کرتا ہے۔ یہی صورت ہمارے ڈراموں میں شامل مسخرہ کرداروں اور کامک حصوں میں دیکھنے میں آتی ہے۔"(5)

کٹھ پتلی کا ناچ: ہندوستان کے ہر علاقے میں زمانۂ قدیم ہی سے کٹھ پتلیوں کے تماشے مروج ہیں۔ صاحبان ناٹک ساگر پروفیسر ہوڑونز کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ پتلیوں کے تماشے کا ذکر سب سے پہلے "مہابھارت" میں ملتا ہے جس میں اسے پنجابی کہا گیا ہے۔ پتلیوں کا تماشا کرنے والا "سوتر دھار" کہلاتا تھا جس کا مطلب رسیوں کو پکڑنے والا ہے۔ سنسکرت ڈراموں میں اسٹیج مینیجر یا ڈائرکٹر کو بھی "سوتر دھار" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔(6)

ایک اور قدیم کتاب "بھارت کتھا" میں ایک لڑکی کی داستان ہے جو متحرک گڑیوں سے کھیلتی تھی، اس سے بھی ان تماشوں کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے۔

قدیم زمانے میں ہندوستان میں پتلیوں کے تماشے عام طور سے مذہبی کھیلوں پر مشتمل ہوتے تھے جن میں مہابھارت اور رامائن کے واقعات دکھائے جاتے تھے۔ بعد میں تاریخی واقعات بھی تمثیل ہونے لگے۔ جیسے سکندر کا ہندوستان پر حملہ، راجہ پورس کی جنگ، دربار اکبری، رانا پرتاپ، شاہ جہانی دربار، امر سنگھ راٹھور۔

پتلیوں کے یہ تماشے قدیم ایام سے لے کر موجودہ دور تک ہندوستان کے علاوہ جاپان، انگلستان اور امریکہ میں بہت مروج رہے ہیں۔ ان ممالک میں قد آدم پتلیاں نہایت اعلیٰ رنگ و روغن سے تیار کی جاتی ہیں جنھیں میکانکی ذرائع سے متحرک کیا جاتا ہے۔ ان میں باضابطہ پلاٹ پر تیار جدید ڈراما پیش کیا جاتا ہے اور یہ اسٹیج پر بالکل انسانی کرداروں یا فلمی تصویروں کی طرح متحرک نظر آتی ہیں۔ جاپان نے خصوصاً اس فن میں بہت ترقی کی۔ جاپانی ڈرامے کی تاریخ میں پتلیوں کا وجود Puppet Drama کی شکل میں 1595 سے 1710 پایا جاتا ہے۔ 1710 کا دور جاپانی پتلیوں کے تماشے کا سنہری دور سمجھا جاتا ہے اور ان کے ڈرامے کو جاپانی فن ڈراما و ادبیات میں خاص مقام حاصل ہے۔

نوٹنکی: نوٹنکی یا سانگیت، رقص و نغمہ اور نقالی کی ملی جلی شکل ہے۔ اس میں اداکاری نقل کے مقابلے میں کچھ بہتر ہوتی ہے۔ اس کے قصے میں پلاٹ بھی ہوتا ہے۔ گو کہ اس کے پیش کش کے طریقے کو اسٹیج کہنا مشکل ہے۔ پھر بھی اس میں پردے اور دوسرے ساز و سامان کی وجہ سے اسٹیج کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔

عشرت رحمانی نوٹنکی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اس کا اثر اندرسبھا پر دکھاتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ نوٹنکی "شہزادی" کو سب سے قدیم نوٹنکی بتاتے ہوئے اس کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

"اور ایک لحاظ سے امانت نے اندرسبھا میں سانگیت نوٹنکی کی طرز کی تقلید کی ہے۔ چھند اور چوبولہ وغیرہ اصطلاحیں جو نوٹنکی میں استعمال ہوتی تھیں اندرسبھا میں بھی نظر آتی ہیں۔ قصے کے ربط کے لیے راوی بھی اسی شان سے جلوہ گر ہے جو نوٹنکی میں ہے۔ اس لیے اس حقیقت کے ماننے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ اندرسبھا نوٹنکی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔"(7)

عشرت رحمانی نے یہ سب کچھ کہہ دیا مگر نہ تو اس کا کوئی تاریخی ثبوت پیش کیا اور نہ کوئی عقلی دلیل۔

یہ سچ ہے کہ نوٹنکی میں چھند اور چوبولہ ہوتا ہے جو اندرسبھا میں بھی استعمال ہوا ہے پھر یہ کہ نوٹنکی کی ابتدا کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے اور اندرسبھا کی ابتدا کا تاریخی ثبوت موجود ہے جس سے وہ خود خاصی پرانی چیز ثابت ہوتی ہے تو یہ عین ممکن ہے کہ نوٹنکی سے اندرسبھا کے متاثر ہونے کے بجائے خود نوٹنکی اندرسبھا سے متاثر ہو۔ عشرت رحمانی نے نوٹنکی "شہزادی" کو قدیم نوٹنکی کا نمونہ بتایا ہے۔ اس سے پہلے نوٹنکی کا کوئی مطبوعہ نمونہ پایا بھی نہیں جاتا۔ نوٹنکی "شہزادی" کے بارے میں اسلم قریشی لکھتے ہیں:

"عشرت رحمانی نے اس کے مصنف اور طباعت کا ذکر نہیں کیا۔ نوٹنکی شہزادی کے عنوان سے ایک ڈراما سید وقار عظیم کی وساطت سے ہماری نظر سے گزرا ہے۔ عشرت رحمانی کے اقتباس اور اس ڈرامے کے موازنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر بھی یہی ڈراما تھا۔ یہ ڈراما پنڈت نتھا رام شرما ہاتھرس نواسی کی تصنیف ہے اور موہن پرنٹنگ پریس علی گڑھ کا چھپا ہوا ہے۔ کتاب کی پشت پر اسی مصنف کے 47 ڈراموں کی فہرست موجود ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پنڈت نتھا رام ڈرامے سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ اس کتاب پر نہ تو تاریخ تصنیف درج ہے نہ تاریخ اشاعت۔ عشرت رحمانی نے اسے قدیم

سنگیت کا نمونہ قرار دیا ہے۔ لیکن اس ڈرامے کے فنی محاسن کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ امانت کی اندرسبھا کے بعد کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اس ڈرامے کی کہانی، پلاٹ کی ترتیب، واقعات میں رکاوٹوں، الجھاؤ اور ان کے سلجھاؤ، سیرت نگاری کی جھلکیوں اور اس زمانے کے ہندو گھرانوں کے معاشرت کے متعلق اشارات اور اس نوع کے دیگر قرائن اور فنی و تکنیکی پہلوؤں کی بنا پر اسے اندرسبھا کے بعد اردو ڈرامے کے ارتقا میں نمایاں حیثیت دی جاسکتی ہے۔''(8)

اسلم قریشی کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اسے بعض فنی تکنیکی پہلوؤں کی بنا پر اندرسبھا کے بعد اردو ڈرامے کی ترقی یافتہ شکل کہا جاسکتا ہے، کیوں کہ تکنیکی اعتبار سے پلاٹ کو مربوط کرنے کے لیے راوی کی موجودگی ایک ترقی یافتہ تکنیک ہے، جو نوٹنکی میں پائی جاتی ہے۔ اندرسبھا میں اس کی ایک ہلکی سی جھلک آمد کی شکل میں ہے۔ اس میں اس تکنیک کا باقاعدہ اور بھرپور استعمال نہیں ہوا ہے۔ رام نرائن اگروال اپنی کتاب ''سانگیت ایک لوک ناٹیہ پرمپرا میں لکھتے ہیں:

''वास्तविकता यह है कि नौटंकी का जो रुप कानपूर में प्रचलित है इस का उदय काल सन् 1690 के आस पास ही है और उस के जनक भी परोक्षत: हाथरस के स्वर्गीय नथ्था राम गौड़ ही हैं।''

اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ عشرت رحمانی جس نوٹنکی کا ذکر کرتے ہیں وہ اندرسبھا کے بہت بعد کی چیز ہے۔

رام نرائن اگروال مذکورہ بالا کتاب میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ بیشک نوٹنکی کے نام سے اب جو چیز پائی جاتی ہے، وہ بہت بعد کی چیز ہے لیکن اس میں استعمال ہونے والے عناصر وہی ہیں جو ''سوانگ'' اور ''بھگت'' میں استعمال ہوتے آئے ہیں اور سوانگ و بھگت بہت پرانی چیز ہے، اس لیے نوٹنکی کو بھی ایک پرانی روایت کہا جاسکتا ہے۔(9)

چونکہ اندرسبھا نے بھی سوانگ و بھگت اور اسی قسم کے بہت سے عوامی اسٹیج کی پرانی روایتوں سے اثر قبول کیا ہے اور نوٹنکی نے بھی، یہی وجہ ہے کہ دونوں میں کہیں کہیں مماثلت پیدا ہوگئی ہے۔

لیکن ہم اس وجہ سے نوٹنکی کو قدیم نہیں کہہ سکتے کہ اس کے اجزا اور عناصر بہت قدیم ہیں۔ ہمیں بحث اس کی موجودہ ہیئت سے ہے نہ کہ اس کے اجزا و عناصر سے اور اگر اجزا و عناصر ہی کی قدامت سے اس کی قدامت ناپی جائے گی تو اندرسبھا کے اجزا و عناصر کی قدامت سے بھی بحث کرنی پڑے گی جو اس سے زیادہ قدیم ثابت ہوسکتے ہیں اور جب نوٹنکی اندرسبھا سے بعد کی چیز ہے تو اس کے اثرات بھی اندرسبھا میں تلاش کرنا فضول ہے۔

مجرے: انیسویں صدی کے وسط میں جب اندرسبھا کی تخلیق ہوئی اس وقت آج کی طرح مختلف وسائل تفریح میسر نہ تھے اور ناچ و گانے کو ہی سب سے بڑا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ یوں تو ان فنون میں ہمیشہ ہی سے مرد بھی کاملانِ فن ہوتے آئے ہیں لیکن اس وقت کے اودھ میں یہ عورت کی وساطت سے زیادہ مقبول تھا۔ لہٰذا انیسویں صدی کے اودھ میں طوائفوں کی جو بہتات تھی اس کے بارے میں عبدالحلیم شرر یوں رقم طراز ہیں:

''اور رفتہ رفتہ ایک ایسا وقت بھی آیا جب مجروں میں شریک ہونا تہذیب کا جز بن گیا۔ اس انتہا کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت جو ادب تشکیل پایا سب پر اس کا اثر ہوا۔ مثال کے طور پر غزل کی خارجیت اور ''زہر عشق'' جیسی مثنویوں کی داخلیت کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اندرسبھا کی تخلیق بھی اسی دور میں ہوئی اور یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنے عہد کی ان معاشرتی چیزوں سے متاثر نہ ہو۔''

لہٰذا آپ دیکھیں گے کہ اندرسبھا میں ایک پری لگاتار کئی گانے گاتی چلی جاتی ہے لیکن ان گانوں کا سلسلہ نہ کہیں قصے سے ملایا جاتا ہے اور نہ کہیں موقع و محل کا خیال رکھا جاتا ہے۔ پھر یہ کہ اندرسبھا میں تمام پریاں اسٹیج پر موجود رہتی ہیں۔ پھر بھی وہ ہمیشہ ایک ایک کرکے الگ الگ ناچتی گاتی ہیں۔ ایک موقع بھی ایسا نہیں آتا جب سب نے مل کر گھیرے کا ناچ ناچا ہو۔

یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ اس وقت طوائفیں اسی طرح تنہا تنہا ناچتی گاتی تھیں اور اس لیے بھی کہ اس وقت کا تماشائی مجروں میں اسی طرح دیکھنے کا عادی تھا۔

اسلامی نظمیں جنگ نامے و مرثیہ خوانی: شاہناموں اور جنگ ناموں میں تاریخ اسلام کے مشہور واقعات مسلمان بادشاہوں بہادروں اور غازیوں کے معرکوں کو نظم میں پیش کیا جاتا تھا۔ ان نظموں کی ادائیگی کا انداز تحت اللفظ ڈرامائی نظم خوانی کا ہوتا۔ چونکہ مسلمانوں میں مشخص کرنے کا عمل معیوب سمجھا جاتا تھا، اس لیے ان کا انداز اس قدر ڈرامائی نہ ہوتا تھا جیسا کہ رام لیلا اور راس لیلا کا تھا۔

عام طور سے اسے ایک آدمی پیش کرتا تھا جو موقع محل کے لحاظ سے ہر قسم کے جذبات کا اظہار ہاتھ کے اشارے چشم و ابرو کی جنبش اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے کرتا تھا لیکن اس کی ان محدود حرکات و سکنات میں بھی کسی حد تک اداکاری نمایاں ہوتی تھی۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس میں کسی نہ کسی حد تک ڈرامائیت ضرور پائی جاتی ہے۔

اس قسم کی ایک چیز یوپی، بہار اور خاص طور سے بندیل کھنڈ میں پائی جاتی ہے جسے 'آلہا' کہتے ہیں۔ اس میں بھی ایک شخص اپنے مخصوص حرکات و سکنات کے ساتھ رزمیہ قصہ پیش کرتا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ مسلمانوں میں شاہناموں اور جنگ ناموں کی پیش کش اسی 'آلہا' کے زیر اثر وجود میں آئی۔

مرثیہ خوانی، سوزخوانی اور نوحہ خوانی کا شمار بھی اسی قسم کی چیزوں میں کیا جاسکتا ہے۔ ان چیزوں کا رواج بھی عرصہ دراز سے چلا آتا ہے۔ عموماً ان میں مظلومین کربلا کے حالات اور کربلا کے واقعات کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تینوں چیزیں نظم میں ہوتی ہیں لیکن مرثیہ کو تحت اللفظ پڑھا جاتا ہے اور سوز و نوحہ ترنم سے ادا ہوتے ہیں۔ ان میں کسی ساز کا استعمال نہیں ہوتا نہ کسی قسم کا میک اپ ہوتا ہے اور نہ ہی لباس و زیورات کا ہی استعمال ہوتا ہے۔ پھر بھی ان کو سننے سے سامعین پر غم واندوہ کی ایسی حالت طاری ہوتی ہے کہ کوئی آنکھ ایسی نہیں ہوتی جو ان واقعات کو سن کر پرنم نہ ہو۔ لہٰذا اس کی پیش کش کا مخصوص ڈرامائی انداز جذبات انگیزی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

یہ عظیم المیہ نثر میں بھی بیان کیا جاتا ہے جسے ''نثرخوانی'' یا ''نثاری'' کہتے ہیں۔ نثار بھی جب ڈرامائی انداز میں کربلا کے مصائب وآلام کی تصویر پیش کرتا ہے تو سامعین میں نہایت دردوغم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

مرثیے کے اجزا میں رجز بھی شامل ہے۔ جس میں مرثیے کا ہیرو میدان میں آنے کے بعد اپنے نسب کی تعریف۔ اسلاف کے کارناموں کا بیان اور فنونِ جنگ میں اپنی مہارت کا اظہار اپنی زبان سے کرتا ہے۔

امانت کے دور میں اودھ میں خصوصاً مرثیے کا کافی دور دورہ تھا اور امانت نے خود بھی بہت سے مرثیے لکھے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ رجز کی تکنیک سے پوری طرح واقف تھے۔ جب انھوں نے ''اندرسبھا'' لکھی تو اس میں اس کا استعمال حسب حال شعرخوانی کے نام سے کیا۔

لہٰذا اندرسبھا امانت میں گلفام کے علاوہ ہر کردار اسٹیج پر آنے کے بعد بالکل اسی طرح حسب حال شعرخوانی کرتا ہے جس طرح مرثیے کا ہیرو میدان میں آنے کے بعد رجز پڑھتا ہے۔

بنگال میں اس قسم کی چیزوں کو ''زاریاں'' کہا جاتا ہے۔

''زاریاں'' صرف کربلا کے واقعات تک محدود نہ رہا بلکہ اس میں یوسف زلیخا اور حضرت ایوب کے واقعات کو بھی نظم کرکے نوحہ اور سوز کی طرح ترنم سے نہایت ڈرامائی انداز میں پیش کرتے تھے۔ ان کی ادائیگی میں کچھ سازوں کو بھی شامل کیا جاتا۔ بنگال میں یہ اب بھی کہیں کہیں نظر آجاتا ہے۔(10)

ان تمام چیزوں کی ڈرامائی حیثیت کے بارے میں محمد اسلم قریشی لکھتے ہیں:

''اس سے قبل بیان کیا جاچکا ہے کہ افلاطون اور ارسطو نے ہومر کی حماسہ نظموں ''اوڈیسی'' اور ''یولی سس'' کو نظم خوانی کی بنا پر نقالی ہی کی ایک قسم شمار کیا ہے اور بنابریں ان کو ڈرامے ہی کی اصناف میں شامل رکھا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ قدیم شاہنامے، جنگ نامے، آلہے، مرثیے، زاریاں وغیرہ نقالی ہی کی صف میں شمار کیے جاسکتے ہیں اور بنابریں ہم ان کو اردو ڈرامے کی قدیم انواع واقسام میں شمار کرسکتے ہیں۔''(11)

قصہ خوانی یا داستان گوئی: داستان گوئی انسان کا قدیم ترین تفریحی مشغلہ ہے اور یہ شغل دنیا کے ہر ملک اور ہر قوم میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے۔

ہمارے یہاں داستانوں سے دلچسپی محض تحریر وتصنیف کے ذریعے بڑے بڑے ادبی کارناموں کو جنم دینے تک محدود نہ رہی بلکہ اس کی ابتدا کے ہر مرحلہ پر داستان نویسی، گویا داستان گوئی ہی کا نتیجہ تھی۔

داستان گوئی کی تاریخی شہادت ہمیں عہد جہاں گیری سے ملتی ہے۔ توزک جہانگیری میں اس کا ذکر ہے۔ قصہ گویوں کے لیے ضروری نہیں تھا کہ کسی خاص محفل میں اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔ وہ بادشاہوں کی درباری محفلوں سے لے کر عام میلے ٹھیلوں اور بازاروں تک میں قصہ گوئی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ محمد حسین آزاد قصہ خوانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ایران کے بازاروں میں اور اکثر قہوہ خانوں میں ایک شخص نظر آئے گا کہ سروقد کھڑا داستان کہہ رہا ہے اور لوگوں کا انبوہ اپنے ذوق وشوق میں مست اسے گھیرے ہوئے ہے۔ وہ ہر مطلب کو نہایت فصاحت کے ساتھ نظم سے مرصع کرتا ہے اور صورت ماجرا کو اس تاثر سے ادا کرتا ہے کہ سماں باندھ دیتا ہے۔ کبھی ہتھیار بھی لگائے ہوتا ہے۔ جنگ کے معرکے یا غصے کے وقت شیر کی طرح بپھر جاتا ہے۔ خوشی کی جگہ اس طرح گاتا ہے کہ سننے والے وجد کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ غیظ وغضب عیش وطرب غم والم کی تصویر اپنے کلام ہی سے نہیں کھینچتا بلکہ خود اس کی تصویر بن جاتا ہے۔ اسے درحقیقت بڑا صاحب کردار سمجھنا چاہیے کیونکہ اکیلا آدمی ان مختلف کاموں کو پورا کرتا ہے جو کہ تھیٹر میں ایک سنگت کرتی ہے۔ ایسی مشکلوں کو قصہ خواں کہتے ہیں۔''(12)

واجد علی شاہی دور میں پورے ہندوستان میں اور خاص طور سے لکھنؤ میں داستان گوئی نے بہت ترقی کی۔ ہر خاص و عام میں اس کا بڑا چرچا تھا۔ سرور ''فسانۂ عبرت'' میں لکھتے ہیں:

''کہیں قصہ خواں فصاحت سے گرم بیان وکہیں بزم شاہ اور اودھ کی حکایت کہیں کابل کی رزم کی داستان ایک طرف خسرو وشیریں کی روایت ذکر رستم فسانہ سیتاں۔''(13)

مسعود حسن رضوی ادیب کو بھی داستان سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''آخری باکمال داستان گو جن پر اس فن کا خاتمہ ہوگیا۔ دہلی کے میر باقر علی مرحوم تھے۔ خوش قسمتی سے ان کو میں نے ایک مرتبہ فرنگی محل لکھنؤ میں داستان کہتے سنا...... لہجے کی تبدیلیوں اور اعضا کی جنبشوں سے وہ کام لیا کہ

ساری محفل ہنسی کے مارے لوٹ گئی۔ ان کی زبان کی پاکیزگی اور بیان کی دلکشی تعریف سے مستغنی ہے۔''[14]

داستان گوئی یا قصہ خوانی میں اگر بھرپور نہیں تو کسی حد تک ڈرامائی عناصر ضرور پائے جاتے ہیں داستان گو بہروپیے اور بھانڈوں کی طرح اپنے لباس اور وضع قطع میں کوئی تبدیلی نہیں کرتے بلکہ ایک محدود حد تک اپنے اعضا کو حرکت دیتے ہیں، ان کے لیے چلنا پھرنا یا بار بار اٹھنا بیٹھنا ممکن نہیں۔ وہ کسی واقعے کے بیان میں آواز کے اتار چڑھاؤ، لہجے کی تبدیلی، چہرے کے تغیر، آنکھوں کی گردش چشم کی حرکات وسکنات سے مختلف حالتوں اور نفسیاتی کیفیتوں کی تصویر کھینچتے ہیں اور مختلف طبقوں کے لوگوں کی قسمیں پیش کرتے ہیں۔ یہ بھی بہروپ کی طرح ایک فن ہے جس میں کسی واقعے یا صورت حال کا ہو بہو سماں آنکھوں کے سامنے پیش کردیا جاتا ہے۔

گھاٹنوں خوانی: رام لیلا اور راس لیلا کو بنگال میں ''یاترا'' اور ''نیلا'' کہا جاتا ہے۔ ڈھاکہ کے مسلمانوں نے ان چیزوں سے متاثر ہوکر ایک قسم کے کھیل کی ایجاد کی جسے گھاٹنوں خوانی کہا جاتا تھا۔ اس میں ہندوؤں یا مسلمانوں کا کوئی مذہبی رنگ نہیں تھا۔ یہ صرف تفریح طبع کا ایک ذریعہ تھا، اس کا تعلق محض ناچ گانے اور بہروپ سے ہے۔ آغا صادق اپنی کتاب ''مجموعۃ الانشا'' میں لکھتے ہیں:

''گھاٹنوں خوانی میں نے نہیں دیکھی مگر اس کا چرچا ضرور سنا ہے...... اس کی صورت کذائی، یہ ہوتی تھی کہ کسی خوبصورت چھوکرے کو گانے بجانے کی تعلیم دیتے۔ ٹھمری اور غزلیں یاد کراتے۔ گانے اساتذہ کے بھی ہوتے اور مقامی شاعروں کے بھی۔ اس شوق میں زیادہ تر مسلمان مبتلا تھے اور اکثر محلہ والوں میں حریفانہ مقابلہ رہتا۔ پہلے کوئی تنومند شخص ایک چھوکرے کو اپنے کاندھے پر بٹھالیتا، ساتھ بڑا مجمع ہوتا جو جھانجھ بجاتا۔ دو ایک ڈھولکیے ہوتے۔ چھوکرا جسے عورت کا لباس اور زیور پہنایا جاتا، گاتا اور ساتھ ساتھ (بھاؤ) بتاتا جاتا۔ یہ ابتدا تھی۔ پھر مقابل والا چھوکرا اس کا جواب دیتا۔ پھر دونوں چھوکرے زمین پر اتار دیے جاتے اور ان کے ناچ ہوتے۔ تماشائی جو چوگرد جمع ہوتے اور تعریف کے پل باندھتے۔''[15]

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''گھاٹنوں خوانی'' بہروپ، شعرخوانی، اور رقص وموسیقی کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے اور اس کی ڈرامائی حیثیت بھی وہی ہے جو ان چیزوں کی ہے۔

حواشی:

1. عشرت رحمانی، اردو ڈراما کا ارتقا، علی گڑھ، 1978
2. عشرت رحمانی، اردو ڈرامے کی تنقید و تاریخ، علی گڑھ، 1975
3. عبدالعلیم نامی، اردو تھیٹر جلد اول، دوم، کراچی، 1962
4. عبدالعلیم نامی، اردو تھیٹر جلد سوم، جلد چہارم، کراچی، 1975
5. عبدالعلیم نامی، بیلوگرافیا اردو ڈرامہ، ممبئی، 1966
6. عظمت علی نامی، مرقع خسروی، قلمی، 1286
7. فصیح احمد صدیقی، اردو یک بابی ڈرامے (چار جلدیں)، ممبئی، 1973
8. کالی داس، شکنتلا (کہانی از کاظم علی جوان)، لاہور، 1963
9. کلیم الدین احمد، فن داستان گوئی، لکھنؤ، 1972
10. کمال الدین حیدر، تاریخ اودھ، لکھنؤ، 1896
11. گزلیش ترامبک دیش پانڈے، بھارتیہ ساہتیہ شاستر، ممبئی، 1960
12. کالی داس، وکرم اروسی (محمد عزیز مرزا)، لاہور، 1961
13. مرزا قتیل، ہفت تماشا، لکھنؤ، 1875
14. مولانا محمد اکرم غنیمت، نیرنگ عشق، لکھنؤ، 1875
15. منشی نولکشور، تاریخ نادر العصر، لکھنؤ، 1261

□□□

مسدود راہیں

ترجمہ وتعارف —— زاہدہ زیدی

''مسدود راہیں'' میں پانچ اہم ترین جدید مغربی ڈراموں کا ترجمہ وتعارف زاہدہ زیدی نے پیش کیا ہے۔ زندگی اور موت، تلاش ذات، عرفان کائنات، تنہائی اور مابعد الطبیعیاتی خلا، انسانی صورت حال، لامحدود کائنات میں انسان کا مقام اور معنی کی تلاش جیسے گہرے اور بنیادی مسائل پر مبنی یہ ڈرامے فنی ندرت اور گہری معنویت کے باوصف جدید مغربی ڈراموں میں شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان ڈراموں کا تعلق بیسویں صدی کے وسط میں ابھرنے والی ایک ایسی ڈرامائی تحریک یا اسلوب سے ہے جس نے جدید مغربی ڈرامے کو انقلاب آفریں تبدیلیوں سے روشناس کرایا اور ڈرامے کے وسیع تر امکانات کو بروئے کار لاکر وجودی تجربے کی گہرائی میں اترنے، لاشعوری کیفیات کو گرفت میں لانے اور ذہن انسانی کے اسرار و رموز کو منکشف کرنے کی کوشش کی۔

صفحات: 406، قیمت -/126 روپے

سید محمد مہدی

(ہماری مطبوعات سے)

سچے سُر کی تلاش

اتر پردیش کا مختصر سا شہر پرتاب گڑھ، نہ تو کسی خاص چیز یا کسی خاص شخص کی وجہ سے مشہور ہے نہ کسی تاریخی عمارت یا یادگار کے لیے۔ ہاں! آج کل اسے اگر "شہرت" حاصل ہے تو اس وجہ سے کہ اس شہر سے ایک ایسے وزیر کا تعلق ہے جو ملک کے قوانین کو اور ان قوانین پر عمل درآمد کو بالکل غیر ضروری بلکہ نقصان دہ سمجھتے ہیں لیکن فی الحال وہ ہمارا موضوع گفتگو نہیں ہیں۔ ہم اس وقت ایک ایسی شخصیت سے آپ کو متعارف کرانا چاہتے ہیں جس پر نہ صرف پرتاب گڑھ کو بلکہ پوری ریاست کو بجا طور پر فخر ہونا چاہیے لیکن جو ایک بہت ہی چھوٹے، پسماندہ گاؤں میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔

پرتاب گڑھ شہر سے چند میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے ڈھنگ وس۔ وہاں پہنچنا آسان نہیں ہے۔ یہ بس کے راستے پر بھی نہیں ہے۔ بس آپ کو اس گاؤں سے چند میل کے فاصلے پر چھوڑ دیتی ہے۔ یہاں سے آپ بیل گاڑی یا گھوڑا گاڑی پر گاؤں جا سکتے ہیں لیکن یہ یاد رکھیے کہ اگر آپ غروب آفتاب کے بعد وہاں جانا چاہیں یا وہاں سے واپس آنا چاہیں تو آپ کو کسی قسم کی کوئی سواری نہیں ملے گی۔ اس وقت ان راستوں پر ان لوگوں کا راج ہوتا ہے جو اب چند برس سے سیاست کے میدان بلکہ قانون ساز اداروں میں بھی نظر آنے لگے ہیں۔

ڈھنگِ وَس میں ایک کمرے کا ایک گھر ہے جس میں رہتی تھی ایک خاتون، نام تھا چھوہارا، جی ہاں چھوہارا، ان کی ماں کا نام تھا بادام۔ کوئی ستر کے پیٹھے میں ہوں گی۔ سر کے بال سفید، بہت دبلی پتلی مختصر سے جسم کی خاتون۔ اولاد نہیں ہے۔ بھائی کے بیٹوں کو گود لیا۔ نام ہیں ہریالے، نرالے دلارے، ہندوؤں میں ہندو ہیں، مسلمانوں میں مسلمان لیکن سچ پوچھیے تو نہ ہندو تھیں نہ مسلمان۔ سنگیت ان کا دھرم تھا موسیقی ان کا ایمان اور یہ فن انھیں سینہ بہ سینہ حاصل ہوا تھا۔ ان کی ماں بہت اچھا گاتی تھیں۔ کلاسیکی موسیقی کی عاشق تھیں۔ خود گاتی تھیں، بیٹی کو سکھاتی تھیں۔ ماں نے بیٹی میں کچھ ایسی لگن، کچھ ایسی اپج دیکھی کہ کسی اونچے مانے ہوئے استاد سے سنگیت سکھانے کے لیے دل بے قرار ہو گیا۔

بنارس اور لکھنؤ، پرتاب گڑھ سے بہت دور نہیں تھے۔ ان دونوں جگہوں پر بہت نامی گرامی استاد موجود تھے۔ بنارس انگ اور لکھنؤ انگ کی ٹھمری ملک میں مشہور ہو چکی تھی لیکن بادام اپنی بیٹی کو لے کر وہاں نہیں گئیں، وہ سیدھی پہنچیں میہر میلوں دور سنٹرل انڈیا کی ایک بہت ہی چھوٹی سی ریاست۔ یہاں ایک ایسا فن کار رہتا تھا جس نے ہندوستانی سنگیت پر ایک امٹ چھاپ چھوڑی یعنی بابا علاء الدین خاں۔ بادام کو ہندوستانی سنگیت کی یقیناً بڑی گہری سمجھ بوجھ رہی ہو گی اور ایک استاد کی حیثیت سے بابا کی غیر معمولی صلاحیتوں سے بخوبی واقف رہی ہوں گی ورنہ وہ گانا سکھانے کے لیے اپنی بیٹی کو ایسے استاد کے پاس کیوں لے جاتیں جو خود سرود دیے تھے اور جن کے شاگردوں میں زیادہ تر سرود اور ستار سیکھنے والے تھے۔ آگے چل کر ان کے بیٹے استاد علی اکبر خاں، ان کی بیٹی انا پورنا اور ان کے شاگرد پنڈت روی شنکر نے سرود، سر بہار اور ستار میں بین الاقوامی شہرت پائی، لیکن بابا ہر فن مولا تھے اور نئے نئے تجربے کرنے سے کبھی گھبراتے نہیں تھے۔ وہ پہلے موسیقار تھے جنھوں نے آرکسٹرا تیار کیا جو بینڈ کے نام سے مشہور ہوا اور آج بھی کسی نہ کسی شکل میں قائم ہے۔ جب مشہور ماڈرن رقاص اودے شنکر نے الموڑے میں اپنا سنٹر قائم کیا تو سنگیت کے لیے بابا ہی کو لے گئے۔ انھوں نے بہت سے گیت کمپوز کیے جو چھوہارا آپ کو سنا سکتی تھیں مثلاً۔

ٹھاڑے رہیو کدم کی چھتیاں
نگریا میں گھر دھر آؤں

غرض کہ چھوہارا کو بابا نے اپنی چھتر چھایا میں لے لیا اور وہ ان سے گانے کے رموز سیکھتی رہیں۔ ساری عمر وہ بابا کا نام بڑے احترام سے لیتی تھیں اور "علی اکبر بھیا، روی شنکر بھیا، انا پورنا دیدی" کا ذکر بڑے پیار سے کرتی تھیں جب بابا سے بہت کچھ حاصل کر چکیں تو پھر اپنے وطن جانے اور ماں سے ملنے کی ہوک اٹھی اور وہ اپنے گاؤں واپس آ گئیں، اب تک ان کی شہرت آس پاس پھیل چکی تھی۔ اس علاقے میں ٹھاکروں کے کئی چھوٹے موٹے رجواڑے تھے۔ ان سب کے دروازے چھوہارا کے لیے کھل گئے۔ شادی بیاہ ہو، جنم دن کی رسم ہو، بچے کی پیدائش ہو، غرض کہ کوئی موقع ہو چھوہارا کی طلبی ضرور ہوتی

"**چند تصویریں — چند خطوط**" سے ماخوذ، مصنف: **سید محمد مہدی/صفحات۔ 221، قیمت: -/80**

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

تھی۔ ہنومان چالیسا، رامائن، پاروتی وندنا، بھجن ... چھوہارا کے پاس ہندو مذہبی سنگیت کا ایک خزانہ تھا جو ختم ہونے ہی پر نہیں آتا تھا۔

لیکن چھوہارا کی روح کو ابھی تسکین حاصل نہیں ہوئی تھی۔ غالباً انھیں ایک ذاتی رہبر، ایک گرو، ایک شیخ، ایک ذاتی استاد کی تلاش تھی۔ بابا علاء الدین ان کے ذاتی گرو تھے۔ وہ جگہ اب کون پُر کرتا! لیکن وہ جو کہا گیا ہے کہ جوئندہ یابندہ، جو تلاش کرتا ہے اسے مل جاتا ہے سو چھوہارا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

ضلع رائے بریلی میں ایک مردم خیز قصبہ ہے سلون۔ یہاں ایک اہم سلسلۂ صوفیہ کی ایک خانقاہ بھی ہے اور مزار بھی۔ یہاں کے ایک سجادہ نشین تھے شاہ نعیم عطا۔ سلون کے اس سلسلۂ صوفیا میں غالباً وہ آخری شخص تھے جنھیں صوفی منش کہا جاسکتا تھا۔ ہمیشہ عالمِ جذب میں رہتے تھے اور اسی عالم میں جب شعر یا گیت کہتے تو آس پاس بیٹھے ہوئے مرید لکھتے جاتے۔ اسی لیے غالباً ان کے کلام کا کوئی مستند مجموعہ مرتب نہیں ہوسکا۔ اودھ کی تہذیب میں بسے ہوئے تھے۔ اردو اور اودھی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ سنگیت کی باریکیوں سے خوب واقف تھے۔ دور اور نزدیک سے گانے والے آتے تھے۔ اگر ان کا گانا پسند آتا تو سنتے رہتے اور مناسب جگہ بتاتے رہتے ورنہ اٹھ کر چلے جاتے تھے۔

چھوہارا بھی ایک دن ان کے فقیرانہ دربار میں پہنچ گئیں اور ''میاں'' کی ایسی مرید ہوئیں کہ ان کی کہی ہوئی ساری چیزیں گلے میں اتار لیں اور ان سے منظوری حاصل کرکے گھروں گھروں سناتی پھریں۔ نعت، منقبت، گیت، بھجن سے اپنا خزانہ اور بھر لیا۔ اب ہندو اور مسلم دونوں گھرانوں میں پذیرائی ہونے لگی۔ فرمائش ہوئی نعت سناؤ تو وہی ''میاں'' کی کہی ہوئی کوئی ایک نعت شروع کردی:

سونی سجریا ہمار نبی جی سونی سجریا ہمار
آس ہے مو ہے تہار نبی جی آس ہے مو ہے تہار
جھانجھر نیا ہے جو بہیا
تم ہی ہو کھیون ہار نبی جی

ایک منقبت کے بول بھجن کے انداز پر ہیں:

بھج رسنا ہر دم علی علی
شیر خدا کے مہابلی
ہوتے ہیں حیدر کے در سے
غوث قطب ابدال ولی
برمن سے نہیں درسن پایوں
جینے سے ایسے موت بھلی

داس نعیم کو بیچ دکھاؤ
شہر نجف کی اب تو گلی

شاہ صاحب کو اپنے پیر شاہ مہدی عطا سے بے انتہا عقیدت تھی کئی گیتوں میں اس عقیدت اور محبت کا اظہار کیا ہے:

بھرلے پانی سکھر پنہاری
ابھیں سویرا کنواں ہے اکیلا
پھر نہ اپیہے بھرن توری باری
بھرلے پانی
مہدی گگریا اتار و نعیم کی
تم نہ اتر یہو تو کوؤ نہ اتاری
بھرلے پانی

چھوہارا کی آواز میں ایک شعلگی تھی جو ان بولوں میں خلوص کی چنگاریاں بھر دیتی تھی اور پھر ایک دن ان سے گاؤں کا ایک طویل سوہر سنا جس کے بولوں نے چونکا دیا اور اندازہ ہوا کہ چھوہارا جس راہ کی تلاش میں تھیں شائد وہ انھیں مل گئی ہے۔ گیت میں کہانی یہ بیان کی گئی ہے کہ بہن بھائی کے گھر آئی اور دیکھا کہ بھاوج کا پاؤں بھاری ہے تو نند بھاوج ''نہای دھوئیں کھڑی تھیں'' اور اس کے بعد:

اللہ کو منائیں، سورج پیاں پڑیں
کہیں اللہ میاں ہمرے بھیا کا دیہو نند لال
بدھاوا لے کے ایہوں

دیکھیے کس بے تکلفی سے نندلال یعنی کرشن بیٹے کا استعارہ بن گئے۔ اودھ کے قصبات میں بیٹے کو عام طور پر پیار سے لالہ ہی کہا جاتا ہے۔

ممکن ہے کچھ لوگوں کو ان چیزوں پر اعتراض ہو کچھ اس کو اچھی نظر سے نہ دیکھیں لیکن وہ جو حضرت بندہ نواز گیسو دراز نے کہا ہے چھوہارا اسی پر عامل تھیں:

کفر کا فرکو بھلا شیخ کو اسلام بھلا
عاشقاں آپ بھلے اپنا دل آرام بھلا

چھوہارا ڈھنگ وس میں اپنے ایک کمرے کے گھر میں مگن تھیں نہ نام و نمود کی طلب نہ زر کی ہوس۔ وہ 'سر کی دنیا میں رہتی تھیں سچے 'سر' کی متلاشی تھیں جس دن سچا سر ہاتھ آگیا وہ جاں بحق ہوگئیں، ان کے لیے حق ہی سچا سر تھا اور سچا سر ہی حق۔

□□□

اردو خبرنامہ

مجاز کی یاد میں پانچ روپئے کا ڈاک ٹکٹ جاری

● نئی دہلی۔ 28 مارچ، نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری نے اردو کے مایۂ ناز شاعر اسرار الحق مجاز کی یاد میں پانچ روپئے کا ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔ نائب صدر نے اپنی رہائش گاہ پر ایک تقریب کے دوران یادگار ڈاک ٹکٹ جاری کرتے ہوئے کہا کہ مجاز اس شاعر کا نام ہے جو اپنی غنائیت آمیز رومانی شاعری کے سبب ایک پوری نسل پر حاوی رہا۔ انھوں نے مجاز سے متعلق فیض کے اس خیال سے اتفاق کیا کہ ان کی شاعری میں شمشیر بھی ہے، ساز بھی ہے اور جام بھی ہے، انھوں نے مجاز کا یہ مشہور مصرعہ دہراتے ہوئے '' کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورشِ دوراں بھول گئے'' کہا کہ واقعی سیاسی زندگی کی معروفیت میں مجھے ایک عرصے کے بعد آج مجاز یاد آئے۔ مواصلات اور اطلاعاتی ٹیکنالوجی کے وزیر شکیل احمد نے کہا کہ مجاز کی یاد میں ایک زمانے سے ڈاک ٹکٹ جاری کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں جو آخر کار آج بارآور ہوئیں۔ پانچ روپئے کے اس ٹکٹ پر مجاز کی تصویر کے ساتھ ان کا یہ خوبصورت شعر درج ہے

بخشی ہیں ہم کو عشق نے وہ جرأتیں مجاز
ڈرتے نہیں سیاستِ اہلِ جہاں سے ہم

مجاز کی چھوٹی بہن بھی جو حمیدہ آپا کے نام سے مشہور ہیں، محفل کو رونق بخش رہی تھیں۔ انھوں نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے کہا کہ مجاز نے کبھی لال جھنڈا لے کر انقلابی نعرے نہیں لگائے بلکہ اس کے گیت گائے۔ مجاز ترقی پسند تحریک کے ڈھنڈورچی نہیں بلکہ اس کے مطرب تھے۔ انھوں نے مجاز کی سب سے بڑی خوبی یہ بتائی کہ وہ بچوں کے ساتھ بچے اور بڑوں کے ساتھ بڑے بن جاتے تھے۔ انھوں نے مجاز کا یہ خوبصورت شعر سنایا:

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

اور کہا کہ مجاز اپنے مخصوص ترنم کی وجہ سے بھی مرکزِ نگاہ بنے رہتے تھے۔ انھوں نے مجاز کی بے کسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ مجاز کا کمرہ کھلا ہوتا تھا لیکن گھر کے دروازے ان کے لیے بند ہوتے تھے۔
مشہور اردو نغمہ نگار اور مجاز کے بھانجے جاوید اختر نے مجاز اور ساحر کے ممبئی کی خاک چھاننے کے واقعات سنائے۔ انھوں نے مجاز کا مقابلہ جرمنی کے شاعر ماخا سے کرتے ہوئے کہا کہ مجاز کی عظمت بھی ماخا کی طرح موت کے بعد سمجھی گئی۔ اس موقعے پر شبانہ اعظمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پی کے عبدالعزیز، اردو کے اہم ناقد شارب ردولوی اور دیگر اہم شخصیات موجود تھیں۔ تقریب کی نظامت آل انڈیا ریڈیو سروس کے انوار خاں نے کی۔
(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

''اردو کی خواتین فکشن نگار'' پر سہ روزہ سیمینار

● نئی دہلی۔ 14 مارچ، ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام'' اردو کی خواتین فکشن نگار'' کے موضوع پر 14 تا 16 مارچ سہ روزہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر شہریار نے کی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس اجلاس میں بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ اس سیمینار کا مقصد اردو میں خواتین افسانہ نگاروں کے فکشن کی افہام وتفہیم کرنا اور ان کی خدمات کا آج کے رجحانات کے پس منظر میں جائزہ لینا ہے۔
اس سیمینار سے یقیناً ایک نیا ڈسکورس شروع ہوگا اور بحث ومباحثے کے نئے دروازے کھلیں گے۔ وہاب اشرفی نے کلیدی خطبہ پیش کیا اور ساہتیہ اکادمی کے نائب صدر پروفیسر ایس ایس نور نے فیمنزم پر گفتگو کی۔ اکادمی کے سکریٹری اے کرشنا مورتی نے سیمینار کے تمام شرکا اور مندوبین کا استقبال کیا اور اجلاس کے آخر میں ساہتیہ اکادمی کے اردو مشاورتی بورڈ کے نئے کنوینر عنبر بہرائچی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔
افتتاحی اجلاس کے بعد سیمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت شین کاف نظام نے کی جبکہ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے '' رشید جہاں: ایک اہم تانیثی آواز'' اسرار گاندھی نے '' ممتاز شیریں اور تانیثیت'' اور نظام صدیقی نے '' خواتین افسانہ نگار: عناصر وعوامل'' کے عنوانات سے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پاکستان کی ممتاز افسانہ نگار زاہدہ حنا نے کی۔ بیگ احساس نے '' طالعہ عابد حسین: انسانی اقدار کی علم بردار'' اور نصرت ظہیر نے '' پاپولر لٹریچر اور فکشن نگار خواتین'' پر مقالے پیش کیے۔
تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کی۔ اس اجلاس میں جیلانی بانو نے اپنا افسانہ '' راستہ بند ہے'' پڑھا جس کا تجزیہ پروفیسر

صغیر افراہیم نے کیا جبکہ ترنم ریاض نے اپنی کہانی ''کشتی'' پڑھی جس کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مشتاق صدف نے کہا کہ کشمیر کی صورت حال پر ''کشتی'' ایک اہم اور حساس کہانی ہے۔ اجلاس میں سوال و جواب کا سلسلہ بھی چلا جس میں بہت سی باتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ سیمینار کے چوتھے اجلاس کی صدارت پروفیسر وہاب اشرفی نے کی اور چودھری ابن النصیر نے ''خدیجہ مستور: آنگن کے حوالے سے''، ساجد رشید نے ''قرۃ العین حیدر: آگ کا دریا کے حوالے سے'' اور پروفیسر صادق نے ''عصمت چغتائی ٹیڑھی لکیر کے حوالے سے'' کے عنوانات سے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔

پانچویں اجلاس کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی جبکہ ترنم ریاض نے ''خواتین اردو ادب میں تانیثی رجحان''، شافع قدوائی نے ''معاصر پاکستانی خواتین افسانہ نگار: مسائل اور موضوعات'' اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے ''معاصر خواتین افسانہ نگار: مسائل ومشکلات'' کے موضوع پر مقالے پیش کیے۔ چھٹے اجلاس کی صدارت نظام صدیقی نے کی جبکہ زاہدہ حنا نے اپنی کہانی ''تکم تکم'' پیش کی جس کا تجزیہ طارق چھتاری نے کیا۔ ذکیہ مشہدی نے اپنی کہانی ''ہدّ و کا ہاتھی'' پڑھی جس کا تجزیہ ڈاکٹر کوثر مظہری نے پیش کیا۔ چھٹے اجلاس کی صدارت صغریٰ مہدی نے کی جبکہ آشا پربھات نے اپنی کہانی ''ایکوریم'' پڑھی جس کا تجزیہ ڈاکٹر مہ جبیں نے کیا۔ ثروت خان نے اپنا افسانہ ''لوک عدالت'' پڑھا جس کا تجزیہ ڈاکٹر وسیم بیگم نے کیا۔ آخر میں عنبر بہرائچی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

اس موقعے پر پاکستان کے نوجوان ناقد ناصر عباس نیر نے بھی اظہار خیال کیا۔

آٹھویں اجلاس کی صدارت پروفیسر قمر رئیس نے کی جبکہ سلطانہ مہر کی کہانی ''تجھے اے زندگی ڈھونڈوں کہاں میں'' سنائی گئی جس کا تجزیہ ڈاکٹر شہزاد انجم نے پیش کیا۔ شمیرہ مسرور نے اپنی کہانی ''لفظوں کی دکان'' پیش کی جس کا تجزیہ ف۔س۔ اعجاز نے کیا۔ نویں اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ صغریٰ مہدی نے اپنی کہانی ''شہر آشوب'' پیش کی جس کا تجزیہ ڈاکٹر فرید پربتی نے کیا۔ غزال ضیغم نے اپنا افسانہ ''مدھوبن میں رادھیکا'' سنایا جس کا تجزیہ ڈاکٹر مولا بخش نے کیا۔ سیمینار کے آخری اجلاس کی صدارت جیلانی بانو نے کی جبکہ نگار عظیم نے اپنا افسانہ ''مادری زبان'' پیش کیا اور اس کا تجزیہ ڈاکٹر امام اعظم نے کیا۔ تسنیم کوثر نے اپنی کہانی ''ملیچھ'' پیش کی جس کا تجزیہ ڈاکٹر رئیس احمد نے کیا۔

آخر میں ساہتیہ اکادمی اردو مشاورتی کمیٹی کے کنوینر اور ممتاز شاعر عنبر بہرائچی نے تمام شرکا اور مندوبین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ تمام اجلاسوں میں بحث ومباحثے کا زوردار سلسلہ چلا۔ (ڈاک سے)

عوامی ذرائع ابلاغ اور ترجمے کا فن اور روایت، پر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سہ روزہ سیمینار

● نئی دہلی۔ 18 مارچ، ٹیلی ویژن کے ذریعے اردو زبان کا جس قدر فروغ ہوا ہے اس سے کہیں زیادہ اردو کے ذریعے ٹیلی ویژن کو فروغ حاصل ہوا۔ ٹیلی ویژن میں اردو کے ناولوں، داستانوں اور کہانیوں پر بنے سیریل اور دوسرے پروگرام بہت زیادہ مقبول ہوتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار آج جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ اردو کے زیر اہتمام ڈی آر ایس (یو جی سی) کے سہ روزہ قومی سیمینار ''عوامی ذرائع ابلاغ اور ترجمے کا فن اور روایت'' کے افتتاحی اجلاس میں ٹیلی ویژن سے متعلق کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے انجم عثمانی نے کیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر پروفیسر بصیر احمد خاں نے کی۔ افتتاح جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر اے کے واسن نے کیا جبکہ نظامت ڈاکٹر شہپر رسول نے کی۔ سیمینار کے کوآرڈینیٹر پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ جلسے کا آغاز حافظ محمد جہانگیر اکرم نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ پروفیسر انیس الرحمٰن نے ترجمے کے فن پر کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے ترجمے کو ایک اشتراکی اور اجتماعی عمل قرار دیا اور ترجمے کے حوالے سے چار سوالات قائم کیے۔ انھوں نے کہا کہ ترجمے کی کوششوں سے ہی ترجمے کی تھیوری وجود میں آتی ہے۔ انجم عثمانی نے ''ٹیلی ویژن اور اردو'' کے موضوع پر اپنے خطبے میں ٹیلی ویژن کی تاریخ پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ٹیلی ویژن کی تاریخ دراصل دوردرشن کی تاریخ ہے۔ انجم عثمانی نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ اپنی ساری خوبیوں کے باوجود اردو صارفیت کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ اس زبان سے فائدے تو حاصل کیے جا رہے ہیں مگر زبان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچنے دیا جا رہا۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر شمس الحق عثمانی نے کہا کہ زبانوں کی شخصی شناخت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ انھوں نے شعبۂ اردو کے میڈیا کے طلبہ سے کہا کہ ادبی تربیت کے بغیر میڈیا میں اہم کردار ادا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ میڈیا کو طاقت ادب ہی پہنچاتا ہے۔ پروفیسر بصیر احمد خاں نے صدارتی خطاب میں کہا کہ وقت کے ساتھ ساتھ زبان میں تبدیلی ایک ناگزیر عمل ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا البتہ بہتر اور سلیس زبان کے لیے ہونے والی کوششیں اس سے زیادہ اہم ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج اردو مدارس سے زندہ ہے۔ اس زبان کی خدمت سب سے زیادہ خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ یہی لوگ کر رہے ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 19 مارچ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کی جانب سے

ذرائع ابلاغ اور ترجمہ نگاری پر منعقد سہ روزہ سیمینار کے دوسرے دن بھی مقالوں مباحثوں اور تقریروں کا سلسلہ جاری رہا۔ آج کے اجلاس کی صدارت پروفیسر افتخار احمد اور انور جمال قدوائی نے کی۔ مہمان خصوصی پروفیسر شمیم حنفی تھے۔ پہلے اجلاس کی نظامت ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے کی جبکہ دوسرے کی نظامت ڈاکٹر کوثر مظہری نے کی۔ اجلاس میں پہلا مقالہ منظر علی نے پڑھا۔ ان کا موضوع ''ٹی وی چینلوں کی اردو زبان کا تجزیاتی مطالعہ'' تھا۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر کوثر مظہری نے پڑھا جنھوں نے ''اصطلاحات، اردو ترجمہ'' پر سیر حاصل اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج بھی سیکڑوں اصطلاحات ایسی ہیں جن کا اردو ترجمہ نہیں ہوا ہے اور جن کا ہوا ہے ان کی حالت بھی کوئی بہت اچھی نہیں ہے بلکہ ایک ایک اصطلاح کے متعدد ترجمے کیے گئے ہیں۔ انھوں نے اس ضرورت کا اظہار کیا کہ اصطلاحات کا ترجمہ کرنے کے پیمانے مقرر کیے جائیں۔ اردو میں وضع اصطلاحات پر ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے مقالہ پیش کیا۔ افتخار احمد خاں نے کہا کہ میڈیا اب ایک بزنس بن چکا ہے۔ بہت سے کاروباری گھرانے میڈیا میں آرہے ہیں۔ ایک زمانے میں جہاں اس بات پر تشویش کا اظہار کیا جاتا تھا کہ ٹی وی سے لوگوں کی دلچسپی گھٹ رہی ہے آج حالت یہ ہے کہ میڈیا کا کاروبار بیس سے پچیس فیصد کی شرح سے ہر سال بڑھ رہا ہے۔ املائی غلطیوں و دیگر ادبی غلطیوں پر کسی ادبی ادارے میں تو تشویش ہوسکتی ہے لیکن میڈیا کو اس کی کوئی فکر نہیں ہوتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہندوستانی میڈیا ابھی ذہنی طور پر بالغ نہیں ہوا ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ میڈیا کا تعلق چونکہ بازار سے ہوتا ہے اس لیے وہ اسی کے حساب سے چلتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر زمانے کا بازار جداجدا ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی کے بعض بے حد رائج الفاظ کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے کہا کہ ہم میڈیا سے ادبی زبان کا مطالبہ نہیں کرسکتے کیونکہ لکھنے کی زبان سے بولنے کی زبان ہمیشہ مختلف ہوتی ہے اور بولنے والی زبان پر ماحول کا بھی اثر پڑتا ہے۔ بازار کا مطالبہ یہی ہے کہ آپ کی بات میں روانی ہو۔ اسی لیے میڈیا زبان میں رائج الوقت دیگر الفاظ کا استعمال غلط نہیں ہے۔ آخر میں پروفیسر شمس الحق عثمانی نے کلمات تشکر پیش کیے۔ پروگرام میں ڈاکٹر شہزاد انجم، ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر شہپر رسول، ڈاکٹر ندیم احمد و دیگر اساتذہ سمیت شعبے کے طلبہ کثیر تعداد میں موجود تھے۔ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● نئی دہلی۔ 20 مارچ، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیراہتمام ڈی آر ایس (یو جی سی) کے تعاون سے ''عوامی ذرائع ابلاغ اور ترجمے کا فن اور روایت'' کے موضوع پر منعقد ہونے والے سہ روزہ قومی سیمینار کے آخری دن 2 اجلاس ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت دیوندر اسّر نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر ندیم احمد نے کی۔ پروفیسر خالد محمود نے ''اردو میں ترجمہ نگاری کی روایت اور فن'' پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ترجمے کے لیے دونوں زبانوں کے لفظ و معنی سے نہ صرف آشنا ہونا ضروری ہے بلکہ ان پر دسترس بھی ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسئلہ صرف دو زبانوں تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اکثر اوقات دو تہذیبوں کا معاملہ بھی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی نے ''علمی کتابوں کے ترجمے کے مسائل اور طریقہ کار'' پر مقالہ پڑھا۔ پروفیسر شافع قدوائی نے ''معاصر صحافتی زندگی کا معروضی محاکمہ'' کے حوالے سے گفتگو کی اور کہا کہ جنوبی اور شمالی ہند کے اخبارات کی زبان ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔ انھوں نے اردو کے اہم روزناموں کی زبانوں کا تجزیہ بھی کیا۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی نے کہا کہ جنوبی ہند کے اخبارات میں عربی الفاظ کی زیادتی کی وجہ وہاں کا ماحول ہے جس میں عربی الفاظ شمالی ہند کی بہ نسبت زیادہ مستعمل ہیں۔ ڈاکٹر شہزاد انجم نے ''ترجمہ نگاری میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کردار'' پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر عابد حسین، پروفیسر مجیب اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا تعلق ترجمہ نگاری کے اس دور سے رہا ہے جب تراجم کے ذریعے دنیا کے جدید علوم کو ہندوستانی معاشرے میں لانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ یہ دور جامعہ کی بہترین علمی و ادبی روایت کا ہے۔ صدارتی خطاب میں دیوندر اسر نے کہا کہ آج کے مترجم کی زیادہ خرابی یہ ہے کہ وہ انگریزی سے واقف ہوتا ہے مگر جس زبان میں ترجمہ کرتا ہے اس سے کم واقف ہوتا ہے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اور نظامت ڈاکٹر شہپر رسول نے کی۔ خورشید اکرم نے ''اداریہ نگاری کا فن اور روایت'' پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ اداریے رائے عامہ کو متاثر کرتے اور لوگوں کو کسی مسئلے پر ازسرنو غوروفکر کرنے اور اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ پروفیسر شاہد حسین نے ''اسٹیج ڈرامے اور زمینی حقیقت'' کے موضوع پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ آغا حشر کے یہاں اردو اور ہندی کا خوب صورت امتزاج ہے۔ ڈاکٹر احمد محفوظ نے ''ترجمہ نگاری میں زبان و تہذیب سے واقفیت'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ زبان اور تہذیب سے واقفیت کا ناگزیر ہونا شاید اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ یہاں ترجمے کا تعلق تخلیقی یا ادبی متون سے ہے جن میں شاعری اور نثر دونوں شامل ہیں۔ زبیر رضوی نے اردو اور ذرائع ابلاغ کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ ذرائع ابلاغ کے اس جدید تر منظرنامے میں اردو ذرائع ابلاغ کی صورت حال مرکزی منظرنامے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ عادل حیات نے ''نکّڑ ناٹک فن اور روایت'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ نکّڑ ناٹک میں سماج کے دبے کچلے لوگوں کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ یہ

سیمینار اس لحاظ سے بے حد اہم اور کارآمد ہے کہ اس میں آج کی جدید زندگی میں میڈیا اور اس سے متعلق مسائل کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ سامنے لایا گیا ہے۔ سیمینار کے کوارڈی نیٹر پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے حاضرین اور خصوصاً طلبہ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ انھی کی وجہ سے یہ پروگرام نہایت کارآمد رہا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

انسانی تہذیب کی تعمیر وتشکیل میں ترجمے کا کردار

● حیدرآباد۔ 24 مارچ، انسانی تہذیب کے ارتقا اور اس کی تشکیل وتعمیر میں دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ ترجمے نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں ایک تہذیب کے ذریعے پروان چڑھنے والے علوم وفنون اور اہم تہذیبی عناصر ترجمے کے ذریعے ہی دوسری تہذیب میں منتقل اور داخل ہوئے۔ ان خیالات کا اظہار جناب حبیب حامد عبدالرحمٰن الکاف صنعا یمن نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں اپنے توسیعی لیکچر کے دوران کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ ترجمہ کے زیر اہتمام ایم اے ترجمہ کے طلبہ و طالبات کے فکری وعلمی افق کو وسیع کرنے اور ترجمے کے میدان میں ان کی عملی رہنمائی کی غرض سے ترجمہ وایڈیٹنگ کے موضوع پر پانچ روزہ توسیعی لیکچرز کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر جناب حبیب حامد عبدالرحمٰن الکاف نے طلبہ و طالبات کو اپنے وسیع علم اور قیمتی تجربات سے استفادے کا موقع عنایت فرمایا۔ انھوں نے ترجمے کی نوعیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ بہترین ترجمہ وہی ہے جس میں اصل مواد کا مفہوم مکمل طور پر ادا ہوجائے اور متن میں سلاست اور روانی برقرار رہے۔ اس خصوصیت کے لیے مترجم کو زبان کا اچھا ذوق ہونا چاہیے۔ ترجمے میں ایڈیٹنگ کی ضرورت پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ زبان وبیان اور مضمون کے مفہوم دونوں کی درستگی کے لیے ایڈیٹنگ ضروری ہے۔ ایک ایڈیٹر کو انتہائی زیرک اور زبانوں کی باریکیوں کا ماہر ہونا چاہیے۔ ایڈیٹر کو جامع انداز میں مفہوم کے ابلاغ کا ملکہ اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جناب حبیب حامد عبدالرحمٰن الکاف پچھلے کئی سالوں سے مختلف ممالک میں ترجموں کے علاوہ دیگر اہم خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ جدہ میں وہ برطانوی سفارتخانے اور برٹش بینک سے طویل عرصے تک وابستہ رہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے برطانوی یونیورسٹیوں میں انگریزی زبان کے مختلف کورسوں کے لیے بھی طلبہ کو تیار کیا۔ اختتامی اجلاس میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے جناب حامد عبدالرحمٰن الکاف نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے مختلف اسکولوں اور شعبہ جات کی کارکردگی پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ شعبۂ ترجمہ کے متعلق انھوں نے فرمایا کہ اس نوعیت کا شعبہ بہت ہی کم جامعات میں موجود ہے جہاں ترجمہ وتالیف کے ساتھ ساتھ ترجمے کے میدان میں تدریس وتربیت کا کام بھی انجام پا رہا ہو۔ جناب الکاف نے اردو یونیورسٹی کے تئیں اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کی ترویج و ترقی میں اس یونیورسٹی سے ملک وقوم کو بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر خالد مبشر الظفر، ریڈر شعبۂ ترجمہ نے مہمان کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر شعبہ کے لکچرر ڈاکٹر محمود کاظمی، محمد جنید ذاکر، فہیم الدین احمد اور ڈاکٹر کہکشاں لطیف کے علاوہ دیگر حضرات بھی موجود تھے۔ (ڈاک سے)

ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات اور اردو۔ ہندی کا تخلیقی ادب

● نئی دہلی۔ 10 مارچ، اردو ہندی ادیبوں کی تنظیم ''ذہن جدید فورم'' کے صدر زبیر رضوی نے فورم کے زیر اہتمام ''ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات اردو اور ہندی کی تخلیقی نگارشات کی روشنی میں'' کے موضوع پر منعقد ہونے والے ایک روزہ سیمینار میں کہا کہ سیاست جہاں انسان کے دکھ درد کا مداوا کرنے کے بجائے اسے زخموں سے کراہتا ہوا چھوڑ دیتی ہے وہاں سے ادب اور فنون کا دست مہرباں اپنی چارہ گری کا عمل شروع کردیتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان ساٹھ برسوں میں دونوں ملکوں کے سیاست داں اور حکمراں دوستی اور رشتوں کے پل گراتے اور بناتے رہے لیکن دونوں طرف کے ادیب اپنی نگارشات میں دوستی اور عوام کے درمیان ہمسائیگی کے رشتوں کے پل بناتے اور انھیں مضبوط کرنے کے عمل میں امن اور جنگ دونوں حالتوں میں سرگرم عمل رہے ہیں۔ سیمینار کا افتتاح ممتاز نقاد فضیل جعفری نے کیا۔ انھوں نے اپنے کلیدی خطبے میں دونوں ملکوں کی الگ الگ پہچان سے پہلے کے غیر منقسم ہندوستان کے ان تاریخی اور سیاسی عوامل کے اہم مرحلوں کا ذکر کیا جو بالآخر 1947 میں ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا سبب بنے ادب میں اس ساری صورت حال کا خاص طور سے تلخ تصادم اور ٹکراؤ کے واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے فضیل جعفری نے کہا کہ آپس میں لڑی جانے والی مسلح جنگیں دونوں متصادم فریقوں کے لیے فیصلہ کن نہیں بن سکیں اس تصادم کی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے دھماکوں کی گونج دونوں ملکوں کی شاعری اور افسانے میں برابر سنائی دیتی رہی ہے مگر اس تخلیقی ردعمل میں ایسا ادب کم ہی سامنے آیا ہے جو دوامیت کا تاثر چھوڑتا۔ سیمینار میں نیشنل اسکول آف ڈرامہ کی جانی پہچانی شخصیت اور ہدایت کار کرتی جین نے تھیٹر اور فلم میں دونوں ملکوں کے عوام کو پیش آنے والے مختلف انسانی مسائل اور مصائب کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ہدایت کردہ ناٹک ''اور کتنے ٹکڑے'' کا تفصیلی ذکر کیا کہ کس طرح دونوں ملکوں کے درمیان فسادات اور تصادم میں عورتیں بے آبرو ہوئیں۔ انھوں نے کہا کہ

ایسی ہی چار عورتوں کی کہانیوں کو انھوں نے ان کے پورے دکھ درد کے ساتھ ناٹک میں سمیٹنے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے کئی فلموں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ فلمیں بڑی حد تک یا تو اینٹی پاکستان ہوتی ہیں یا پھر مسلمانوں کو شک کے دائرے میں گھیرنے والی یا پھر ان کی وطن دوستی کو مشکوک بنانے والی۔ پروفیسر شمیم حنفی نے ہمسائیگی اور تخلیقی ادب کو موضوع بناتے ہوئے اپنے مضمون میں کہا کہ یہ عجیب بات ہے کہ تقسیم اور دونوں ملکوں کے درمیان تصادم کے واقعات پر War Andpeace جیسا بڑا ناول نہیں لکھا گیا۔ شمیم حنفی نے کہا کہ ہمسائیگی پر جو کچھ سرحد کے دونوں طرف لکھا گیا وہ یہی احساس دلاتا ہے کہ عوام دونوں ملکوں کے درمیان امن کو مستحکم دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہندی شاعر منگلیش ڈبرال نے ہندی شاعری کے حوالے سے کئی ایسی مثالیں دیں جو عوام دوستی کے جذبے سے لبریز ہیں۔ انھوں نے اپنی باتوں میں اختر الایمان اور دوسرے شاعروں کی نظمیں بھی کوٹ کیں، زبان، نامی تنظیم کی روح رواں اروشی بٹالیہ نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تنازعے اور تصادم کے مختلف مرحلوں میں بے آبرو ہونے والی بہت سی عورتوں کی کہانیاں سنائیں جو انھوں نے خود ان متاثرہ عورتوں سے ملاقاتیں کرکے حاصل کی ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے صغیر افراہیم نے اردو ناولوں میں تصادم اور ہمسائیگی کے کئی حوالے دیتے ہوئے وضاحت کی کہ محض تعلقات اور انسانی رشتوں کو موضوع بنانے والے ناول تو بہت کم ہیں مگر ترکِ وطن کے نتیجے میں زندگی جس طرح اجڑی اور اس کو دوبارہ آباد کرنے میں دونوں طرف کے مہاجروں پر دکھ اور غم کے جو پہاڑ ٹوٹے وہ بڑے پردرد ہیں۔ اردو ہندی کے نمائندہ شاعروں اور افسانہ نگاروں نے اپنی نوعیت کے اس پہلے سیمینار میں شرکت کی۔ آخر میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور مرلی منوہر پرشاد سنگھ نے بھی خطاب کیا سیمینار کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور غالب انسٹی ٹیوٹ کا سرگرم اشتراک حاصل تھا۔ (ڈاک سے)

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کی چار روزہ تقریبات

● فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے زیر اہتمام 24 تا 27 مارچ 2008 چار روزہ تقریبات کا انعقاد کیا گیا۔ پہلے دن ''اردو افسانے میں دبے کچلے طبقوں کے مسائل کی عکاسی'' کے زیر عنوان ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر طارق سعید، عشرت ظفر اور مسرور جہاں نے اپنے مقالے پیش کیے۔ پہلا مقالہ محترمہ مسرور جہاں نے پیش کیا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں کہا کہ اردو افسانوں میں دبے کچلے طبقے کی عکاسی ترقی پسند تحریک سے شروع ہوئی۔ پریم چند پہلے افسانہ نگار تھے جنھوں نے نچلے طبقے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند کے بعد ان کی اس روایت کو زندہ رکھنے کا کام رشید جہاں نے کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، قاضی عبدالستار، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، جوگندر پال اور علی امام نقوی کے افسانوں کا حوالہ دیا۔ دوسرا مقالہ عشرت ظفر صاحب نے پڑھا انھوں نے کہا کہ اردو افسانے کا سفر تقریباً سو سال کا احاطہ کرتا ہے۔ دبا کچلا طبقہ پہلے بھی تھا، آج بھی ہے اور اس وقت تک رہے گا جب تک طبقاتی کشمکش اور تقسیم باقی رہے گی اور یہ ختم ہونے والی نہیں۔ طبقات کے درمیان فاصلوں کو کم کیا جاسکتا ہے نچلے طبقے کے حالات میں سدھار کیا جاسکتا ہے مگر دنیا کے تمام انسانوں کو مالی، علمی، طبقاتی طور پر ایک سطح پر لانا ممکن نہیں ہے۔ طارق سعید صاحب نے اپنے مقالے میں کہا کہ راشد الخیری کی ''مظلوم کی فریاد ہو'' یا بیدی کا ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' اردو افسانہ ہمیشہ ہی ظلم کے خلاف اور عدل و انصاف کا حامی رہا ہے۔ انھوں نے مختلف افسانوں کی مثالیں پیش کیں۔ ڈاکٹر شارب ردولوی نے اپنے مقالے میں کہا کہ اردو افسانوں میں ابتدا سے ہی مہاجنوں کے مظالم کے قصے نظر آتے ہیں۔ دبے کچلے طبقے کے مسائل کو پیش کرنا اردو افسانے کی روایت رہی ہے ترقی پسند مصنفین نے خاص طور پر غریب و متوسط طبقے کو اپنا موضوع بنایا۔

آخر میں سوال و جواب کے دوران غضنفر علی نے تمام مقالوں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں اس موضوع پر لکھا تو گیا ہے مگر بہت کم۔ جبکہ فیاض رفعت نے کہا کہ اردو میں دلت ادب لکھا ہی نہیں گیا یہ صرف مراٹھی زبان میں لکھا گیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ دلت ادب صرف دلت ہی لکھ سکتا ہے۔

اگلے دن 25 مارچ 2008 کو بزم افسانہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس افسانوی محفل کا آغاز محسن خاں کے افسانے ''صاحب کا کتا'' سے ہوا انھوں نے بیوروکریسی کی ناہمواریوں اور ناانصافیوں کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا اور آزاد ہندوستان میں نوکری پیشہ لوگوں کے استحصال کا ذکر طنزیہ انداز میں کیا ان کا یہ نیا افسانہ ندرتِ اظہار اور پرکشش ماجرائی کیفیت کے لیے یاد رکھا جائے گا۔ دوسرا افسانہ غضنفر علی نے پڑھا جو بدلتی ہوئی قدروں کے زوال پر مبنی تھا۔ افسانے میں انھوں نے جنریشن گیپ کو بہت ہی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے ان کے افسانے نے ماحول کو سنجیدہ بنا دیا اور بزم میں موجود نوجوان اپنے والدین کے ساتھ اپنے سلوک کو لے کر فکرمند نظر آئے۔ تیسرا افسانہ احمد ابراہیم علوی صاحب نے پیش کیا جن کا شمار ہند و پاک کے پختہ کار افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانے کا ہیرو روایتی قافلے میں شامل ہونے کے بجائے نئی دنیا کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ افسانے میں عورت کو تخلیق و تحریک کے نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے چوتھا افسنہ شاہنواز قریشی صاحب کا تھا ''زندگی سے دو قدم پرے'' اس میں کہانی کی کمی محسوس ہوئی مگر کیفیت کو بہت ہی خوبصورتی کے

ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اگلا افسانہ عابد سہیل صاحب نے پیش کیا ''پھوہڑ کے ہاتھ میں گیلی مٹی کا بونڈ'' بظاہر سادہ ہی نظر آنے والی کہانی ہے۔ کردار وبھوتی کا استعمال ایک اشاریے کے طور پر کیا گیا ہے افسانے میں ایک اشاراتی کردار کہانی کار بھی ہے جو اپنے کرداروں کو اپنی مرضی سے چلاتا ہے انھیں اذیت دیتا ہے اور جب اسے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اب وہ اس کے قابو سے نکل رہے ہیں تو انھیں مار دیتا ہے۔ مگر وہ پھر جی اٹھتے ہیں (جیسے اردو والے) ان کا جی اٹھنا ہی جبر وظلم کی شکست کا علامیہ ہے۔ موقعے کی مناسبت سے کی گئی تخلیق پر عابد سہیل مبارک باد کے مستحق ہیں۔ آخری افسانہ بشیشر پردیپ نے پیش کیا۔ جس میں انھوں نے معاشرے کو ایک پیغام دیا ہے کہ بیٹی بھی بیٹوں کی طرح ہوتی ہے انھوں نے افسانے میں عورت کی عظمت کو بیان کیا ہے کہ وہ کس طرح مردوں سے پیچھے نہیں۔ افسانے کا موضوع نیا نہیں تھا مگر اپنے زبان و بیان کے لحاظ سے سامعین افسانے سے متاثر ہوئے۔

تقریب کے تیسرے دن ''غلام رضوی گردش حیات شخصیت اور خدمات'' کے زیر عنوان ایک پروگرام کا اہتمام کیا گیا۔

غلام رضوی گردش شاعر بھی تھے اور افسانہ نگار بھی۔ لیکن وہ اپنی خاکہ نگاری کی بدولت ایک ایسا نقش ثبت کر گئے جو اس مرتی ہوئی صنف کو زندہ رکھے گا۔ وہ ایک کامیاب ڈرامہ نگار بھی تھے۔ انھوں نے شخصی ڈرامے بھی لکھے جس میں یگانہ چنگیزی کی سوانح پر لکھا گیا ڈرامہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

اس پروگرام میں وقار ناصری، شافع قدوائی، ڈاکٹر شفق اشرفی اور دلیل اللہ چودھری نے اپنے مقالے پیش کیے۔ تمام مقالہ نگاروں نے غلام رضوی گردش کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ غلام رضوی گردش پر گفتگو خصوصاً خاکہ نگار کی حیثیت سے کی گئی۔ تمام مقالہ نگاروں میں وقار ناصری صاحب کا مقالہ خاص طور سے قابل توجہ رہا۔ گردش سے ان کی قربت رہی تھی لہٰذا وہ ان کی ذاتی اور ادبی زندگی سے بخوبی واقف ہیں۔ دلیل اللہ چودھری کا مقالہ کافی طویل تھا بعض جگہ تلفظ کی خرابی ذہن پر گراں گزری۔ شافع قدوائی نے اختر الایمان پر لکھی گئی کتاب کے حوالے سے گردش کی خاکہ نگاری پر مضمون پڑھا۔

اس پروگرام کی صدارت سابق صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی ڈاکٹر محمود الحسن صاحب نے کی اور غلام رضوی گردش کی شخصیت پر روشنی ڈالی۔

آخری دن ''اردو کی ابتدائی تعلیم ،مسائل اور ہماری ذمے داریاں'' کے زیر عنوان مقالات پڑھے گئے اردو تعلیم آج کا سب سے سنجیدہ موضوع ہے اس پر مختلف مقالہ نگاروں نے اپنے نظریات پیش کیے، سبھی نے اس خیال کا اظہار کیا کہ سرکار کو آٹھویں تک اردو کو لازمی کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے اپنے مقالے میں کئی ایسے Data پیش کیے جو قابل غور ہیں۔ انھوں نے سرکاری اداروں سے شائع ہونے والی نصابی کتب میں املا اور کتابت کی اغلاط کی نشاندہی کی اور کہا کہ اردو کی نصابی کتابیں بے توجہی کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں۔ سراج اجملی اور فاروق جائسی نے بھی اردو تعلیم کے مسائل پر روشنی ڈالی۔ غضنفر نے کہا کہ اکثر لوگ اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم اس لیے نہیں دیتے ہیں کہ اس میں روزگار کے مواقع بہت کم ہیں لیکن ایسا سوچنا غلط ہے۔ اردو تعلیم یافتہ افراد کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور خاص طور سے میڈیا میں جانے کے لیے تو اردو کی تعلیم بہت ضروری ہے۔

اترپردیش میں دینی مدرسوں کے علاوہ کوئی بھی سرکاری یا غیر سرکاری اسکول موجود نہیں ہے۔ جہاں باقاعدہ طور پر اردو کی تعلیم دی جاتی ہو۔ اردو میڈیم اسکول تو کوئی ہے ہی نہیں۔ اردو کے زوال کی وجہ حکومت کی بے توجہی بھی ہے لیکن خود اردو والے بھی اس کے ذمے دار ہیں۔ اگر ہم انفرادی طور پر اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دیں تو اس طرح کسی حد تک زبان کا فروغ ممکن ہے۔

آخر میں چیئرمین فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی جناب ندیم اشرف جائسی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا کہ انھیں اس عہدے پر فائز ہوئے ابھی ایک ماہ کا عرصہ ہوا ہے اس دوران وہ گذشتہ کاموں کا جائزہ لے رہے ہیں انھوں نے کہا کہ اردو میں پی ایچ ڈی کرنے والے 170 اسکالرز کی تھیسس کو فیئر کرنے کے لیے مالی امداد دی جاتی تھی لیکن اس وقت تک صرف 40 عرضیاں ہی موصول ہوئی ہیں جنھیں منظوری دی جا چکی ہے انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر تمام یونیورسٹیوں کے صدور شعبہ کا تعاون حاصل ہوسکا تو ان سبھی طالب علموں کو جو مالی امداد کے مستحق ہیں کمیٹی سے تعاون حاصل ہوسکتا ہے۔

(ڈاک سے)

علامہ شبلی نعمانی کا علمی وفکری اجتہاد

● نئی دہلی۔ 26 مارچ، علامہ شبلی نعمانی کی عظمت و برتری کا انکار کوئی کافر ادب ہی کرسکتا ہے۔ اس پر کوئی سوال ہی نہیں قائم کیا جاسکتا کہ علامہ نعمانی کی ادبی خدمات کیا ہیں۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام علامہ شبلی نعمانی کا علمی وفکری اجتہاد کے موضوع پر منعقدہ دو روزہ سیمینار میں مولانا عقیل الغروی نے کیا۔ وہ مولانا شبلی نعمانی، مسائل کلام وحکمت پر اپنا مقالہ پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ علمی وفکری موضوعات پر مکمل دلائل پیش کرنے کی روایت علامہ شبلی نعمانی نے قائم کی اور کئی گراں قدر کتابیں تصنیف کیں۔ شبلی نعمانی کی زندگی مکمل ثقافتی و مذہبی بنیادوں پر قائم تھی۔ انھوں نے کہا کہ آج ایسی شخصیت نایاب ہیں جن کے یہاں زندگی کے تمام ابواب روشن ہوں۔ مولانا غروی نے علامہ شبلی نعمانی کی علم کلام میں خدمات کو گناتے ہوئے کہا کہ علم کلام میں علامہ

شبلی نعمانی نے وحدانیت اور نبوت پر تو بالتفصیل کلام کیا ہی ہے لیکن اس کی ایک بنیادی کڑی معاد پر استدراک کی ہے۔ ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی نے ''علامہ شبلی نعمانی اور خدمت دفاع اسلام'' پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ یورپ کے دانشوران اور مفکرین کے اغراض و مقاصد کو واشگاف کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی نے انہی کے اسلوب میں اعتراضات کے جوابات دیے۔ انھوں نے کہا کہ علامہ شبلی کی شناخت جہاں ادیب کی حیثیت سے ہوتی ہے وہیں وہ مورخ کی حیثیت سے بھی جاتے جاتے ہیں، ادب کے اساطین میں شمار کیے جانے کے ساتھ مورخ کہلانا بھی وہ پسند کرتے تھے۔ وہ اسلام کی تائید و نصرت کا غلبہ دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی مستشرقین کی طرف سے اسلام پر کیے جانے والے حملوں کا جواب دینے میں گزار دی۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے ''علامہ شبلی شخصیت و افکار کچھ نئی باتیں'' پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ علامہ شبلی نعمانی کی انشا پردازی حالی کی طرح بالکل سادہ نہیں ہے بلکہ اس میں حلاوت و چاشنی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ کوئی قوم محض ماضی پر تکیہ کرکے زندہ نہیں رہ سکتی۔ تعلیم کے بارے علامہ شبلی کا نظریہ تھا کہ قدیم و جدید کے نظریے سے بالاتر ہوکر مفید جدید تعلیم سے بھی آراستہ ہونا وقت کا اہم تقاضہ ہے۔ خواتین کے بارے میں بھی علامہ شبلی نعمانی کا نظریہ تھا کہ انھیں چہاردیواری میں محبوس رکھ کر تعلیم سے محروم رکھنا سراسر ناانصافی ہے۔ سیمینار کی اس نشست کی صدارت ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں اور نظامت ڈاکٹر اقتدار محمد خاں نے کی۔ اس نشست میں ڈاکٹر ارشد نے بھی شبلی اور تعلیم پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ علامہ شبلی نعمانی کی ایسی شخصیت تھی جس نے نئے راستے نکالے اور اجتہاد سے روشناس کرایا۔

بالخصوص تعلیم و تصنیف کے میدان میں انھوں نے وہ کام انجام دیا جو صدیوں سے موقوف تھا۔ غزالی کا علم کلام آج قدیم ہو چکا ہے آج ضرورت ہے جدید علم کلام کی۔ علامہ شبلی نعمانی نے اپنی زندگی کی قلیل مدت میں دارالمصنفین، شبلی اسکول، شبلی کالج قائم کیے۔ اب حالات بدل گئے ہیں اب یہاں نہ انگریز ہیں اور نہ ہی استعماری طاقتیں۔ ہمیں پوری آزادی حاصل ہے آج دہشت گردی، جہاد، مدارس اور قرآن شریف کے بارے میں جو جھوٹی باتیں پھیلائی جارہی ہیں ان کا مقابلہ ہم اسی طرح کریں جس طرح سے علامہ شبلی نے کیا تھا۔ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

پروفیسر محمود شیرانی توسیعی خطبہ

● اودے پور، 19 فروری 2008 کو صبح دس بجے شعبۂ اردو موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی اودے پور (راجستھان) میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تعاون سے ــــ ''1857 کی پہلی جنگ آزادی کے بعد تحریک آزادی میں راجستھان کے اردو شعرا کا کردار'' کے موضوع پر دوسرے پروفیسر محمود شیرانی توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ مقرر راجستھان یونیورسٹی جے پور کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر فیروز احمد تھے۔ چیئر پرسن کے طور پر موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی کی آرٹ فیکلٹی کے ڈین پروفیسر آر. این. ویاس شریک رہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر ایس. آر. ویاس اور پاکستان کے مشہور فکشن رائٹر جناب انتظار حسین تھے۔ پروگرام کے آغاز میں یونیورسٹی کے شعبۂ موسیقی کے طالب علم علی سید حسین نے اپنی خوبصورت آواز میں راجستھان کا لوک گیت ــــ ''پدھارو مہارے دیس'' بطور استقبالیہ پیش کیا۔ موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر رئیس احمد نے شعبۂ اردو اور یونیورسٹی کی جانب سے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور محترم انتظار حسین، پروفیسر فیروز احمد، پروفیسر آر. این. ویاس اور پروفیسر ایس. آر. ویاس کی گلپوشی کے لیے شعبۂ اردو کی جانب سے ڈاکٹر اسما مسعود، ڈاکٹر فرغانہ، شبنم حسین اور ڈاکٹر شکیلہ رضوی کو دعوت دی۔ پروفیسر آر. این. ویاس نے جناب انتظار حسین کو شال اور مومینٹو پیش کیا۔ پروفیسر ایس. آر. ویاس نے پروفیسر فیروز احمد کو شال اوڑھایا اور مومینٹو پیش کیا۔ ڈاکٹر رئیس احمد نے پروفیسر فیروز احمد اور جناب انتظار حسین کا مختصر مگر جامع تعارف پیش کیا اور اسی تعارفی سلسلے کے تحت ہندی زبان کے معروف نقاد پروفیسر نول کشور، رضوانہ امام اور ڈاکٹر اسما مسعود نے اپنے اپنے مقالے بالترتیب ''انتظار حسین کا ناول۔ بستی''، ''انتظار حسین فکر و فن کے آئینے میں'' اور ''افسانہ ''شہر افسوس'' کا تجزیاتی مطالعہ'' پیش کیے۔

پروفیسر فیروز احمد نے ''1857 کی پہلی جنگ آزادی کے بعد تحریک آزادی میں راجستھان کے اردو شعرا کا کردار'' کے موضوع پر سیر حاصل مقالہ پیش کیا۔ جس میں راجستھان کے بہت سے شعرا کے کلام کو اپنی بات کی تصدیق میں بطور خاص پیش کیا۔

توسیعی خطبے کے اختتام پر جناب انتظار حسین نے 1857 کی پہلی جنگ آزادی اور تحریک آزادی کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ پروفیسر محمود شیرانی کی لسانی خدمات اور ان کی علمی و ادبی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے شعبۂ اردو اور موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی اودے پور کو پروفیسر محمود شیرانی میموریل توسیعی خطبہ سیریز قائم کرنے پر مبارکباد پیش کی۔ بعد ازاں بزم ادب کی جانب سے منعقد کیے گئے مضمون نویسی کے مقابلے میں بی. اے. اور ایم. اے. کی سطح پر اول، دوم اور سوم قرار دیے گئے طلبہ و طالبات کو انتظار حسین صاحب نے انعامی میڈل عطا کیے۔ بی. اے. کی سطح پر شاہد بیگ، دلشاد رضوی اور جنید قاسم علی، ایم. اے. کی سطح پر رضوانہ بانو، انجم جہاں اور محمد

جنید شیخ بالترتیب اوّل، دوم اور سوم انعام کے مستحق قرار دیے گئے۔ ڈاکٹر رئیس احمد نے مہمان خصوصی، یونیورسٹی اسٹاف، ریسرچ اسکالر محمد عادل، بزم ادب کی صدر رضوانہ امام، شعبۂ اردو کے جملہ اساتذہ اور حاضرین جلسہ کے علاوہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک و تعاون پر تشکر کا اظہار کیا۔ (ڈاک سے)

1857 اور اردو ادب

● علی گڑھ۔ 25 مارچ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام ''1857 اور اردو ادب'' پر دو روزہ نیشنل سیمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ 1857 ابھی تک قصۂ پارینہ نہیں ہوا ہے اگرچہ اس کو ڈیڑھ سو سال ہو گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ 1857 کے واقعات میں اردو زبان نے جو کردار ادا کیا ہے وہ کسی اور زبان نے نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ 1857 کے انقلاب سے بہت پہلے سے ہی اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے اس کی بشارت دے دی تھی اور خود مرزا غالب مستقبل شناس تھے۔ انھوں نے رام پور کے نواب کو جو خطوط لکھے ان میں اس چنگاری کا ذکر کیا تھا جو بعد میں شورش بن گئی۔ انھوں نے وائس چانسلر سے اپیل کی کہ وہ شعبۂ اردو میں غالب چیئر قائم کریں۔ اس سے قبل سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے وائس چانسلر پروفیسر پی کے عبدالعزیز نے کہا کہ 1857 کے انقلاب کے بعد ہی ہندوستانی سماج میں تبدیلیاں آنا شروع ہو گئی تھیں اور برٹش سامراج کے خلاف نفرت کا ماحول تیار ہو گیا تھا۔ وائس چانسلر نے کہا کہ سر سید احمد خاں بھی 1857 کی پیداوار ہیں اور انھوں نے ملک کی سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے اور جدید علوم و فنون سے عوام کو متعارف کرنے کے اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے علی گڑھ میں ایک ادارہ قائم کیا جو آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس تحریک کو آگے بڑھانا ہم سب کا بنیادی فریضہ ہونا چاہیے۔ پروفیسر محمد حسن نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ مستقبل کو سنوارنے کے لیے جنھوں نے اپنا حال قربان کر دیا، آج ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کا وقت آیا ہے۔ انھوں نے 1857 کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مولوی محمد باقر اور امام بخش صہبائی نے اپنی جانیں تک نچھاور کر دیں اور بہت سے لوگوں کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔ اس تحریک میں بہت سی عورتوں نے بھی قائدانہ کردار ادا کیا جن کے نام ابھی تک منظر عام پر نہیں آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایم اے او کالج، دارالعلوم دیو بند اور بعد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام بھی 1857 کے حالات سے رونما ہونے والے واقعات کی روشنی میں کیا گیا۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر زاہد نے مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے 1857 کی جنگ کو ملک کی جنگِ آزادی سے تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ ہر شخص آزادی چاہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمام مذاہب کے لوگوں نے اس میں حصہ لیا۔ افتتاحیہ جلسے کی نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے پروفیسر جمال حسین نے کہا کہ مورخ کسی بھی واقعے کے تاریخی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے جب کہ ادیب اس واقعے کو اپنے نظریے سے دیکھتا ہے۔ (صحافت، دہلی)

ہند اسلامی تہذیب کے رنگ عقیدت کے سنگ

● نئی دہلی۔ 15 اپریل، غیر تعلیم یافتہ اور کم تعلیم یافتہ لوگ تعلیم یافتہ لوگوں سے زیادہ سیکولر ہوتے ہیں۔ ہندوستان روز اول سے ہی مشترکہ تہذیب کا گہوارہ رہا ہے اور اسے برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔ تمام مذاہب کے پیروکار مشترکہ تہذیب کو اپنائیں تاکہ ہندوستان ہر طرح کی دہشت گردی، ظلم و فساد اور زیادتیوں سے پاک و صاف ہو سکے اور امن و سلامتی کا مکمل گہوار ہو سکے۔ ان خیالات کا اظہار اصغر علی انجینئر نے اندرا گاندھی نیشنل سینٹر فار دی آرٹس (اگنکا) کے زیر اہتمام ''ہند اسلامی تہذیب کے رنگ عقیدت کے سنگ'' کے موضوع پر منعقد 4 روزہ سیمینار کے اختتامی اجلاس میں کیا۔ صدارت جسٹس ایم۔ایس۔اے۔ صدیقی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ اسلام کا دہشت گردی سے دور دور تک تعلق نہیں ہے لیکن کچھ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا اسلام اور مسلمان کو جہادی ثابت کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ آٹھویں سیشن کی صدارت ڈاکٹر خالد محمود نے کی، اس میں تین مقالے پیش کیے گئے۔ غلام سرور یوسف نے اسلام اور مشرق وسطیٰ کی روایتوں اور جنوب مشرق ایشیا کے تھیئٹر میں انڈونیشیا اور ملیشیا کے خصوصی حوالے سے روشنی ڈالی۔ راجندر رنجن چترویدی نے ''بوعلی شاہ قلندر اور فوک مائنڈ'' پر مقالہ پڑھا، جس میں انھوں نے کہا کہ پانی پت کی 12 درگاہوں میں سب سے بڑی درگاہ بوعلی شاہ قلندر کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ قلندر کا سلسلۂ نسب ابوحنیفہؒ سے جا کر ملتا ہے، وہ عراق سے پانی پت آئے تھے۔ ایس رضا حیدر نے ''انیس کے مرثیہ کے دو کردار'' پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ کربلا کو انیس نے اس طرح پیش کیا ہے جیسے وہ خود بھی وہاں شریک ہوں۔ بعد ازاں پینل ڈسکشن کا انعقاد کیا گیا۔ جس کے کنوینر پروفیسر اختر الواسع تھے۔ اس پینل ڈسکشن میں شریک لوگوں نے اپنی اپنی تجاویز بھی پیش کیں۔ ان تجاویز پر ممبر سکریٹری اگنکا ڈاکٹر کلیان کمار چکرورتی نے عمل درآمد کی بات کہی۔ پروگرام کی کنوینر ایسوسیٹ پروفیسر و صدر جنید اسید اگنکا نے کہا کہ عقیدت کے رنگ اور مشترکہ تہذیب پر لفظی باتیں چار دنوں میں خوب ہوئیں۔ گلزار دہلوی نے کہا کہ چار دن سے جس موضوع پر پروگرام ہو رہا ہے، وہ وقت کی اہم ضرورت ہے اور مشترکہ تہذیب پر اشعار بھی پیش کیے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کسی ذات دھرم کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ

مشترکہ تہذیب کی سب سے میٹھی زبان ہے۔ آٹھویں سیشن کی صدارتی کلمات میں ڈاکٹر خالد محمود نے کہا کہ ہندوستان میں شاعری کی تمام اصناف باہر سے آئی ہیں۔ مرثیہ واحد صنف ہے جو کہ ہندوستانی ہے۔ ساتویں سیشن کی صدارت غلام سرور یوسف نے کی، جس میں فاطمہ شہناز، مجیب رضوی اور مجاہد حسین حسینی نے عقیدت کے رنگ پر اظہار خیال کیا۔ چھٹے سیشن کی صدارت پروفیسر صغریٰ مہدی نے کی۔ جس میں حامد نسیم رفیع آبادی اور جعفر رضا بلگرامی نے اظہار خیال کیا۔ یوگندر سنگھ نے بھی پرمغز مقالہ پیش کیا۔ ایس لیاقت معینی نے خواجہ معین الدین چشتی کے حوالے سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس سیشن میں خطبہ عام سیدہ سیدین حمید نے دیا جس کی صدارت زویا حسن نے کی۔ سیدہ حمید نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب میں مسلمان خواتین کے تاریخی رول پر روشنی ڈالی۔ اس ضمن میں انھوں نے جہاں شاہی پس منظر کی ملکہ نور جہاں، رضیہ سلطان، ممتاز محل، زیب النساء کا ذکر کیا وہیں اردو ادب وصحافت کی تاریخ کے اوراق سے محمدی بیگم، اشرف النساء، رقیہ ثقافت حسین، شفیق فاطمہ، صغرا ہمایوں ظفر اور یوسف زماں سے لے کر نذر سجاد حیدر، رشید جہاں، عصمت چغتائی کا ذکر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ بیسویں صدی کے شروعاتی سالوں میں ہی مسلمان خواتین میں بیداری کی لہر آچکی تھی۔ دوسرا پبلک لیکچر جے این یو کی پروفیسر ڈاکٹر زویا حسن کا تھا۔ ڈاکٹر حسن کا کہنا تھا کہ ماضی میں ہماری بزرگ خواتین جس جرأت کے ساتھ تعلیمی وتخلیقی افق پر ابھر کر سامنے آئیں اس کے مقابلے میں 60 برسوں بعد آج ہم بہت پیچھے ہیں اور سنجیدگی سے اس سلسلے میں غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ پبلک لیکچر کے بعد شام کو منعقد کلچرل پروگرام میں نوئیڈا کی ریتا حیدر نے خدا اور رسولؐ خدا کی شان میں حمد، نعت پیش کی۔ آخر میں میلاد کلاسیکی صوفی موسیقار مدن گوپال سنگھ (دہلی) اور راجستھان کے ٹونک سے آئے فنکاروں نے چہار بیت پیش کیں۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

جھارکھنڈ میں اردو کے مسائل

● اردو نہ صرف ایک ترقی یافتہ زبان ہے بلکہ قومی یکجہتی کی زبان بھی ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں اس کی حصہ داری کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ ہندوستان میں اردو کی موجودہ خستہ حالی کا ذمے دار ایک حد تک ملک کا بٹوارا ہی ہے۔ ملک کے بٹوارے سے اردو زبان کو نقصان پہنچا۔ ان باتوں کا اظہار ڈاکٹر جوگیندر سنگھ نے 24 فروری کو دھنباد میں منعقد ایک روزہ سیمینار ''جھارکھنڈ میں اردو کی پسماندگی: وجوہات وحل'' میں کیا۔ ڈاکٹر سنگھ نے کہا کہ کہ جدید ٹکنالوجی سے بھی نہ صرف اردو کو بلکہ دوسری زبانوں کو بھی کافی نقصان پہنچا ہے۔ فون اور موبائل نے اس دور میں خط وکتابت کا سلسلہ تقریباً ختم کردیا ہے۔ انھوں نے بہت حد تک مسلمانوں کو بھی خود اپنی زبان کو چھوڑنے کا ذمے دار ٹھہرایا اور مسلمانوں سے اردو کے فروغ کے لیے اپنے بچوں کو اردو میں تعلیم دلوانے کی اپیل کی۔ انھوں نے اپیل کی کہ اردو جاننے والے نوجوان اپنے اپنے علاقوں میں اردو سکھانے کی مہم چلائیں۔ مہمان خصوصی محمد شریف قریشی کارگزار چیئرمین 15 نکاتی پروگرام نفاذ کمیٹی، حکومت بہار نے کہا کہ اردو کی پسماندگی کی کئی وجوہات ہیں۔ جن علاقوں میں اردو کا زیادہ فروغ ہوا وہاں اردو زبان پہلے سے موجود تھی اور وہاں کے لوگوں نے اسے دل سے اپنایا۔ جھارکھنڈ کے باشندوں کو اس میں اپنے پن کی جھلک نہیں ملی جس کی وجہ سے وہ اسے بیرونی تصور کرتے رہے اور اسے دل سے نہیں اپنا سکے اردو کی پسماندگی کا ایک سبب اس علاقے میں مدرسوں اور دوسرے تعلیمی اقلیتی اداروں کی کمی بھی ہے۔ اردو رسالے اور اخبارات اردو کے فروغ میں معاون رہے لیکن اتفاق سے جھارکھنڈ سے اردو کا کوئی رسالہ یا اخبار نہیں نکلا اردو کے فروغ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود اردو والے ہی ہیں جو اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم نہیں دیتے۔ اردو میں درخواست نہیں دیتے۔ ہم اردو کی ترقی چاہتے ہیں تو اپنے بچوں کو اردو پڑھنے کی طرف راغب کرنا ہوگا۔ اقلیتی تعلیمی ادارے کھولنے ہوں گے۔ مرکزی حکومت کے .C.B.S.E اور .I.C.S.E نودوے ودیالیہ اور کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیہ میں اردو کی پڑھائی کو لازمی قرار دینا ہوگا۔ مسلم اکثریت آبادی والے علاقوں میں اسکول اور کالج کھولنے کی مانگ کرنی ہوگی۔ جہاں دس مسلم بچے بھی ہوں وہاں ایک اردو ٹیچر ہونا لازمی قرار دیا جائے۔ امارت شرعیہ کے ناظم اعلیٰ مولانا انیس الرحمٰن قاسمی نے کہا کہ اردو ہماری مادری زبان ہے۔ اس کے فروغ کے لیے بہار اور جھارکھنڈ میں کام تو ہورہا ہے۔ لیکن اس محاذ پر مزید سرگرم ہونے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اس طرح کے سیمینار ہر ضلعے میں کرانے پر زور دیا۔ مہمان ذی وقار آندھرا پردیش اردو اکادمی کے نائب صدر ایس.کے. افضل الدین نے کہا کہ آندھرا پردیش میں جہاں مسلمانوں کی آبادی 9 فیصد ہے اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے حکومت نے 18 کروڑ کا سالانہ بجٹ رکھا ہے۔ لیکن بہار اور جھارکھنڈ میں مسلمانوں کی آبادی 15 فیصد ہے تو جھارکھنڈ میں اردو اکادمی ہی نہیں ہے، بہار میں ہے بھی تو بجٹ محض ایک کروڑ کا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جو قوم اپنی زبان چھوڑ دیتی ہے وہ قوم زندہ نہیں رہتی۔ انھوں نے نوجوانوں سے آگے آکر اردو کے فروغ کے لیے کام کرنے کی اپیل کی۔ محمد قمر اختر نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ اردو کے فروغ میں سب سے بڑی رکاوٹ اردو کو کسی خاص مذہب سے جوڑ دینا ہے۔ جبکہ زبان وادب کا کسی مذہب یا قوم سے کوئی لینا دینا نہیں۔ اردو نے کئی نامور ادیب، نقاد اور شاعر پیدا کیے جن کا مذہب اسلام سے کوئی رشتہ نہیں۔ اردو اور ہندی دونوں جڑواں بہنیں ہیں اور یہ گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہیں۔ انھوں نے اردو کی پسماندگی کے لیے حکومت کے رویے کو ذمے دار ٹھہراتے ہوئے مسلمانوں کو بھی بہت حد تک ذمے دار ٹھہرایا۔ زبان کا کسی مذہب سے

کوئی رشتہ نہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو زیادہ تر مسلمانوں کی مادری زبان ہے۔ اس کے باوجود ہم اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم نہیں دیتے۔ عصری علوم کے ساتھ ساتھ ہمیں اردو اور دین کی تعلیم بھی دینی چاہیے۔ آج ہم انگریزی اور ہندی کے اخبارات اور رسالوں کو میز کی زینت بنا چکے ہیں۔ اردو کے اخبارات یا رسالے خرید کر نہیں پڑھتے۔ انھوں نے وزیر اعلیٰ جناب مدھوکوڑا کو اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے پر مبارکباد دیتے ہوئے اردو زبان کی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے عملی اقدامات پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ جھارکھنڈ میں اردو اکادمی قائم کی جائے اور زیادہ سے زیادہ فنڈ مہیا کرایا جائے۔ اردو ڈائرکٹوریٹ قائم کیا جائے۔ سرکاری دفاتر میں تختیاں اردو میں بھی لگائی جائیں۔ اردو اخبارات کو اشتہار دیے جائیں۔ سبکدوش آئی.اے.ایس شری رام دوبے نے کہا کہ جس نے زبان کی عزت نہیں کی وہ اپنی ماں کی عزت نہیں کرسکتا۔ انھوں نے اس پر افسوس جتایا کہ اردو کو مسلمانوں سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ زبان کسی کی جاگیر نہیں ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ دور میں اردو زبان کا جو حال ہے وہ کسی سے چھپا نہیں ہے۔ ہم اردو کی بدحالی کو دور کرنے کے لیے ایماندارانہ کام کریں گے تو اردو زبان کی ترقی خود بہ خود ہوگی۔ مغربی بنگال سے تشریف لائے جناب عبدالرؤف ٹرسٹی مسلم ایجوکیشن سوسائٹی نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے مشترکہ جدوجہد کی ضرورت ہے۔ جمعیۃ العلماء کے صدر ابراہیم قاسمی نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے ٹھوس قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ قریش امام جامع مسجد شاہد قاسمی، امارت شرعیہ کے مفتی شاہد صاحب، خالد فاؤنڈیشن کے ڈاکٹر خالد اعجاز علی، کانگریس کے صغیر حسن، تحریک ادب کے سراج احمد نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سیمینار کی شروعات کول فیلڈ یتیم خانے کے طالب علم صادق کی کلام پاک کی تلاوت سے ہوئی اور اختتام جناب انیس الرحمٰن قاسمی کی دعاؤں سے ہوا۔ اس سیمینار کے افتتاح کے لیے جناب علی جاوید ڈائرکٹر قومی اردو کونسل کو مدعو کیا گیا تھا لیکن وہ اپنی دوسری مصروفیات کی بنا پر تشریف نہیں لا سکے۔ سیمینار دھنباد شہر کے آئی.ایم.اے. ہال میں ہوا۔ (ڈاک سے)

مادری زبان میں بنیادی تعلیم ضروری

● حیدرآباد۔ 30 مارچ، جسٹس ای اسماعیل رکن انسانی حقوق کمیشن نے کہا کہ مادری زبان جس سے ہر ایک کو محبت ہوا کرتی ہے، اگر اس زبان میں بنیادی تعلیم کو مضبوط و مستحکم کیا جائے تو اس بات کی توقع ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مشکلات پیدا نہیں ہوں گی۔ اس لیے کہ بنیادی تعلیم کی بڑی اہمیت ہوا کرتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار وہ پریس کلب بشیر باغ میں منعقدہ سیمینار ''مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم کی اہمیت'' پر کر رہے تھے۔ سیمینار کی صدارت مختار احمد فردین نے کی۔ مہمانوں کے ہاتھوں ادبی مقابلوں میں کامیاب طلبہ میں انعامات تقسیم کیے گئے۔ رحیم الدین انصاری صدرنشین اردو اکادمی نے کہا کہ آندھرا پردیش اکادمی کو اس بات کا اعزاز حاصل ہے کہ وہ ایک بڑے بجٹ کے ساتھ مختلف اسکیم و انفراسٹرکچر کے ساتھ اردو کی ترقی کے لیے کام کر رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ حکومت نے اردو مدارس کی مقبوعہ جائیدادوں کے تقررات کے لیے ایک کروڑ کا بجٹ مختص ہے۔ ایس کے افضل الدین نائب صدرنشین اردو اکادمی نے کہا کہ ہندوستان بھر میں ریاست کی اردو اکادمی کو اس بات کا اعزاز حاصل ہے کہ وہ 30 کروڑ کے بجٹ سے اردو کے فروغ کے لیے شب و روز کوشاں ہے۔ عابد عبدالواسع ایسوسیٹ ایڈیٹر منصف نے کہا کہ اردو میں اعلیٰ تعلیم کا حصول اس وقت ممکن ہے جبکہ مادری زبان کو اس سے جوڑ دیا جائے۔ سیمینار سے ضیاء الدین قادری (سہارا گروپ)، مصطفیٰ علی سروری (سیاست)، جیلانی خان (سہارا گروپ)، وصال اعظم (ای ٹی وی اردو)، غلام ربانی (موظف) ڈپٹی رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی، منور النساء منور، حمید اللہ حسینی، احمد کمیش فتح اللہ خان نے بھی خطاب کیا۔ (منصف، حیدرآباد)

انشائیہ — روایت و امکانات

● حیدرآباد۔ 14 مارچ، انشائیے کو اتنا الجھا دیا گیا ہے کہ مزاح کو بھی انشائیہ سمجھا جانے لگا ہے۔ انشائیے کے سلسلے میں پاکستان میں وزیر آغا نے کئی تحدیدات عائد کر دیں اور بالکل اس طرح لکھنے والوں کی رہنمائی کی جس طرح جدید نقادوں نے افسانہ نگاروں کو گمراہ کیا تھا۔ لکھنے والا جب رہنمایانہ خطوط پر لکھنا شروع کرتا ہے تو وہ آورد کا شکار ہو جاتا ہے۔ میں انشائیے کو انفرادی اور آزادانہ سوچ کا عمل سمجھتا ہوں اور لکھتے وقت یہ کبھی نہیں سوچتا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں، ان خیالات کا اظہار مجتبیٰ حسین نے شمع روشن کر کے چار روزہ بین الاقوامی سیمینار ''انشائیہ — روایت و امکانات'' کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ اس سیمینار کی افتتاحی تقریب 10 مارچ 5 بجے شام سی وی رمن آڈیٹوریم یونیورسٹی آف حیدرآباد میں منعقد ہوئی جس کا اہتمام شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد میں منعقد ہوئی جس کا اہتمام شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد نے کیا۔ ابتدا میں پروفیسر بیگ احساس صدر شعبۂ اردو نے مہمانوں کا استقبال کیا اور کہا کہ ہندوستان میں انشائیہ کو ایک مردہ صنف تصور کیا جاتا ہے لیکن اس سیمینار میں اس کی روایت کو تازہ کیا جائے گا اور امکانات بھی تلاش کیے جائیں گے۔ ڈاکٹر مظفر شہ میری ڈائرکٹر سیمینار نے کہا کہ انشائیے کا آغاز ہندوستان والے سرسید تحریک سے کرتے ہیں اور پاکستانی وزیر آغا سے اس کے آغاز کا دعویٰ کرتے

ہیں۔ پروفیسر موہن جی رمن نے اسکول آف ہیومانٹیز کی جانب سے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور انگریزی انشائیے کے ارتقا پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ دنیا کے عظیم انشائیے انگریزی میں لکھے گئے۔ اس تقریب میں دو کتابوں کا اجرا کیا گیا۔ ڈاکٹر محمد حسنین کی تصنیف ''انشائیہ اور انشائیے'' کے ساتویں ایڈیشن کا جس کو شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ رسم اجرا رحیم الدین انصاری صدر نشین آندھرا پردیش اردو اکادمی نے کی۔ دوسری کتاب محمد زماں آزردہ کے انشائیوں کا تلگو ترجمہ ''پرتی بمبو'' تھا جو شمشاد ایم علی نے کیا ہے، اس کی رسم اجرا ڈاکٹر سید احتشام حسنین وائس چانسلر نے ادا کی۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے انشائیے کو علاحدہ صنف نہیں بلکہ مضمون کا وصف قرار دیا۔ پروفیسر محمد زماں آزردہ (کشمیر) نے کہا کہ وہ خود انشائیہ نگار ہیں اس لیے وہ خود کو آم کھانے والوں میں شمار کرتے ہیں پیڑ گننے والوں میں نہیں۔ انھوں نے کہا کہ انشائیہ بھی ''کشمیر'' جیسا ہے جس کے حدود متعین نہیں کیے جاسکتے۔ ناصر عباس نیر (پاکستان) نے کہا کہ پاکستان میں بڑی حد تک انشائیے کے حدود متعین کر دیے گئے ہیں اور وہاں انشائیہ خوب لکھا جارہا ہے۔ انشائیہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ رحیم الدین انصاری نے اس سیمینار کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور آندھرا پردیش اردو اکادمی کے تعاون کا یقین دلایا۔ ڈاکٹر سید احتشام حسنین نے صدر شعبۂ اردو اور رفقائے شعبہ کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کے والد ڈاکٹر محمد حسنین اردو کے پروفیسر تھے، وہ اردو کی روٹی کھا کر بڑے ہوئے ہیں۔ وہ سائنٹسٹ ہیں لیکن اردو لکھنا اور پڑھنا جانتے ہیں۔ پروفیسر بیگ احساس صدر شعبۂ اردو کے شکریے پر اس تقریب کا اختتام ہوا۔ (منصف، حیدرآباد)

ہائیکو پر خصوصی لیکچر اور انڈو جاپان مشاعرہ

● نئی دہلی۔ 28 مارچ، آج جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں رفتار ادبی فورم، جاپان فاؤنڈیشن اور انڈو جاپان ایسوسی ایشن فار لٹریچر اینڈ کلچر کے اشتراک سے جاپانی شاعری کے مقبول ترین صنف ہائیکو پر خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا گیا، جس میں ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو کے استاد پروفیسر اسد ایوتاکا، جاپان فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر جناب ناکانڈو اور ''ہم نشیں'' کے صدر ڈاکٹر شکیل معین مہمان خصوصی تھے۔ پروگرام کے آغاز میں رفتار ادبی فورم کے سرپرست ڈاکٹر انور پاشا نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ہائیکو کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اردو شاعری میں جو اہمیت و مقبولیت غزل کو حاصل ہے وہی مقبولیت و اہمیت جاپانی شاعری میں ہائیکو کو حاصل ہے۔ جس طرح غزل لسانی حدود کو توڑ کر قومی و عالمی سطح پر دوسری زبانوں میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے، اسی طرح ہائیکو بھی تمام لسانی حدود کو توڑ کر دنیا کی مختلف زبانوں میں مقبولیت اختیار کر چکی ہے۔

اسکول آف لنگویجز کے ڈین پروفیسر وریام سنگھ نے پروگرام کا افتتاح کیا اور اسے انڈو جاپان ثقافتی رشتے کی مضبوطی کے حوالے سے ایک اہم قدم قرار دیا۔ پروفیسر اسد ایوتاکا نے جاپانی شاعری میں ہائیکو کی روایت اور تاریخ پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے ہائیکو کے مشہور جاپانی شاعر تانیداسانتو کی ہائیکو نگاری پر مفصل گفتگو کی۔ انھوں نے تانیداسانتو کی تخلیق کردہ پچیس نمائندہ ہائیکو نظموں کا شعری ترجمہ بھی پیش کیا۔ جسے قارئین نے خوب سراہا۔ جے. این. یو. کے سابق ڈین اور ممتاز دانشور پروفیسر ایم. ایچ. قریشی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے اس پروگرام کو اپنی نوعیت کا ایک اہم پروگرام قرار دیا۔ جلسے کی صدارت ''ہم نشیں'' کے صدر ڈاکٹر شکیل معین نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر پاشا نے اردو اور جاپانی ادیبوں اور شاعروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے دونوں زبانوں اور ادب میں باہمی تبادلے اور قرابت کی ایک اچھی روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔ عالمی سطح پر ایسی کاوشوں کے بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔ انڈو جاپان ایسوسی ایشن فار لٹریچر اینڈ کلچر کی صدر ڈاکٹر اودیتا سچد انند نے مہمانوں کو گلدستے پیش کیے۔ اس جلسے میں جے. این. یو. کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ بڑی تعداد میں دہلی یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ اور طلبہ و طالبات موجود تھے۔ پروگرام کے آخر میں انڈو جاپان مشاعرے کا بھی اہتمام کیا گیا۔ جس میں جاپانی مہمان اسد ایوتاکا، جاپانی ریسرچ اسکالر مراکامی اسوکا کے علاوہ شکیل معین، ظفر صدیقی، گووند پرشاد، اخلاق آہن، ہادی سرمدی، حفظ الرحمٰن، ظفر اللہ انصاری اور مشکور عالم نے اپنا کلام سنایا۔

(ڈاک سے)

عربی ادب میں مزاح نگاری

● نئی دہلی۔ 25 مارچ، کوئی مرد کسی مرد کا اور کوئی عورت کسی عورت کا ہرگز مذاق نہ اڑائے۔ نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارے۔ کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے آپسی اختلافات کو ہوا ملے گی۔ اور آپس میں تناؤ پیدا ہونے کا خوف بھی یقینی ہے۔ ان خیالات کا اظہار صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی محمد نعمان خان نے ''عربی ادب میں مزاحیہ نگاری'' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار آرٹس فیکلٹی دہلی یونیورسٹی میں کیا۔ انھوں نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ پیارے نبی نے بالکلیہ ہنسی مذاق سے منع نہیں فرمایا بلکہ تہذیب اور ادب کے دائرے میں رہ کر مذاق کیا جائے اور لوگوں کے دلوں کو

صرف بچی باتوں سے بہلایا جائے۔ اس موقع پر سعودی سفارت خانہ کے ثقافتی سفیر شیخ ابراہیم بن محمد مہمانِ خصوصی کے طور پر مدعو تھے۔ ان کے علاوہ پروفیسر سلیمان اشرف، بدرالدین الحافظ، شفیق احمد خان، پروفیسر زبیر احمد فاروقی، پروفیسر ایوب تاج الدین ندوی، پروفیسر حبیب اللہ خان، پروفیسر عبدالقدوس وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ سیمینار میں کل 11 مقالے پڑھے گئے۔ اس موقع پر مہمان خصوصی اور افتتاحیہ پروگرام کے صدر ابراہیم بن محمد الشطان نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ عربی ادب نے ہی طنز ومزاح کی پرورش کی۔ یعنی عربی زبان وادب طنز ومزاح کی اصل ہے اور دیگر زبانوں نے اس کی نقل کی۔ پروفیسر سلیمان اشرف نے کلیدی خطبے میں کہا کہ عربی زبان وادب میں جس آسانی کے ساتھ طنز ومزاح کو پیش کیا جاتا ہے۔ وہ صرف اسی زبان کا خاصہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے پیارے نبیؐ کے پاس ایک بوڑھی صحابیہ آئیں اور انھوں نے خود اپنے متعلق سوال کیا کہ کیا میں جنت میں جاسکوں گی؟ آپ نے مذاقاً فرمایانہیں کوئی بوڑھی جنت میں نہیں جاسکے گی۔ آپ کا یہ جواب سنتے ہی وہ صحابیہ رونے لگیں پھر آپ نے فرمایانہیں ایسی بات نہیں ہے بلکہ تم بھی جنت میں جاؤ گی مگر جوانی کی حالت میں۔ آپ نے فرمایا کہ تمام انسان خواہ مرد ہوں یا عورت سب ہی جوانی کی حالت میں جنت میں جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ عرب ممالک میں ایک عورت کسی پینٹر کے پاس گئی اور اس نے کہا کہ مجھے شیطان کی تصویر بنا دو مصور نے کہا کہ میں نے شیطان کو نہیں دیکھا ہے اس کے بعد مذکورہ خاتون اس وقت عربی زبان کے اسکالر اور ادیب جاحظ کو لے کر گئی اور کہا کہ جاحظ کی مشابہت والی تصویر بنا دو کیونکہ شیطان کی شکل اس سے ملتی ہے اس پر مصور ہنسنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ جاحظ سیاہ فام شخص تھا، اخیر میں ڈاکٹر نعیم الحسن لیکچرر شعبۂ عربی کے شکریہ کے کلمات کے ساتھ سیمینار اختتام پذیر ہوا۔ مذکورہ پروگرام تین نشستوں میں چلا پہلے افتتاحیہ پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر ولی اختر ندوی نے انجام دیے۔

(صحافت، دہلی)

افغانستان میں معاصر فارسی ادب

● نئی دہلی۔ 24 مارچ، شعبۂ فارسی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کے زیر اہتمام 24 مارچ 2008 کو اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز کے سیمینار ہال میں معاصر افغانی ادب پر ایک روزہ سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔ اس سیمینار میں افغانستان کے معروف شاعر پرتو نادری، افسر رہبین، اکادمی علوم افغانستان کے اراکین اکبر جان پولاد، عبدالجبار عابد، روزنامہ اصلاح کے ایڈیٹر شمس الحق آریان فر کے علاوہ خانم فریدہ، محمد حامد مصلح، احمد جاوید، محمد الیاس، بانو مہریہ، بانو حسینہ شامل ہوئیں۔ پروگرام کی صدارت ہندوستان میں افغانستان کے سفیر اور معروف فارسی استاد دانشور ڈاکٹر سید مخدوم رہین نے کی اور آئی سی سی آر کے وائس چیئرمین سید شاہد مہدی مہمان خصوصی تھے۔ سیمینار میں افغانستان کی موجودہ ادبی صورت حال اور افغانستان میں معاصر فارسی ادب کے مختلف پہلوؤں پر مقالے پیش کیے گئے اور تفصیل سے گفتگو ہوئی۔ پروگرام کی ابتدا میں اسکول کے ڈین پروفیسر وریام سنگھ نے مہمانانِ ذی وقار کے خیر مقدم کے ساتھ ہی افغانستان و ہند کے سیاسی و ثقافتی رشتوں کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ صدر شعبہ پروفیسر سید اختر مہدی نے اپنی تقریر میں جدید افغانی فارسی شعر وادب کے ساتھ معاصر افغانی ادب کی تدریس کی اہمیت و افادیت پر زور دیا اور اس موقع پر اعلان کیا کہ آئندہ اس شعبے میں اس کو عملی طور پر متعارف کرایا جائے گا تا کہ معاصر افغان فارسی ادب سے ہمارے طلبہ آشنائی حاصل کرسکیں۔ مہمان خصوصی سید شاہد مہدی نے شعبۂ فارسی، جے این یو کی ان کوششوں کی تعریف کی اور فارسی ادب میں نئے تجربات کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔ شعبہ میں کابل یونیورسٹی کے وزیٹنگ پروفیسر ڈاکٹر عبدالخالق رشید نے معروف افغان شاعر پرتو نادری کا تعارف کرایا اور ان کی ادبی وعلمی خدمات کا ذکر کیا۔ جلسے میں شعبے کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ کے اساتذہ پروفیسر عراق رضا زیدی، ڈاکٹر عبدالحلیم اصغر اور ڈاکٹر کلیم اصغر کے علاوہ دوسرے شعبوں سے وابستہ حضرات بھی شامل ہوئے۔ **(صحافت، دہلی)**

دوہا پر دو روزہ سیمینار

● بالمیکی نگر (ہند نیپال سرحد) رامائن کے خالق مہرشی بالمیکی کی سرزمین بالمیکی نگر (چمپارن) میں گذشتہ دنوں ''ہم نشیں'' بہار کے زیر اہتمام دوہا پر ایک دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد ہوا۔ دو دنوں کے اس سیمینار میں مقالے پڑھنے والوں میں ڈاکٹر انور پاشا (نئی دہلی) ڈاکٹر مولا بخش (نئی دہلی) ڈاکٹر نسیم احمد نسیم (پٹنہ) پروفیسر فاروق احمد صدیقی (مظفر پور) ایم ایم وفا (بگہا) پروفیسر آر کے رُوی، ڈاکٹر سنجے پنکج (مظفر پور) شامل تھے۔

ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے اپنے مقالے میں دوہا کو اپنی جڑوں سے تعبیر کیا، اور اسے عوام وخواص میں سب سے زیادہ مقبول صنف قرار دیا۔ مولا بخش کے مطابق دوہا آسمان اور زمین کے درمیان موجود تمام حالات و کیفیات کو سمیٹنے کا فن ہے۔ ایم ایم وفا نے اردو دوہوں کا ذکر کرتے ہوئے اس صنف کو تمام اصناف میں اہم قرار دیا۔ ڈاکٹر انور پاشا نے دوہا کو سہل اور پر اثر شاعری قرار دیا، اور شاعری کی روح کہا۔ پروفیسر فاروق احمد صدیقی نے دوہا کو صوفی سنتوں کی صنف قرار دیا، جس کے توسط سے عوام تک ان کے پیغامات کی رسائی ہوتی رہی۔ اس موقعے پر ہندی ادیبوں نے بھی اپنے پرچے پڑھے۔

ڈاکٹر شکیل معین نے مہمانِ خصوصی جسٹس نیر حسین (پٹنہ ہائی کورٹ) کا استقبال کیا اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ سیمینار کے اختتام پر متعدد ادیبوں اور شاعروں کو ہم نشیں ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ معروف شاعر دھرو گپت کے شعری مجموعہ ''موسم کے بہانے'' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ (ڈاک سے)

مولانا عبدالماجد دریابادی کا 116واں یوم ولادت

● بارہ بنکی۔ 16 مارچ، حالات حاضرہ احساس ذمے داری کی کمی سے جوجھ رہا ہے۔ 21ویں صدی کے چیلنجوں کو نئی نسل سمجھ نہیں پا رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار اتر پردیش اقلیتی کمیشن کے چیئرمین غیاث الدین قدوائی نے آج مولانا عبدالماجد دریابادی کے 116ویں یوم ولادت پر رضاکار تنظیم رابطہ سیوا اسنستھان کے زیر اہتمام ''حالات حاضرہ اور مولانا عبدالماجد دریابادی'' عنوان پر منعقدہ سیمینار کی افتتاحی تقریر میں کیا۔ جناب قدوائی نے کہا کہ مولانا دریابادی ایسا روشن چراغ ہیں جس کی روشنی میں نئی نسل اپنا راستہ تلاش کر سکتی ہے۔

دینی تعلیمی کونسل کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی نے اس موقع پر کہا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں کے اس جملے کا عملی نمونہ تھی جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ہمیں ایک ایسی قوم کو وجود میں لانا ہے جس کے ہاتھوں میں سائنس، فلسفہ اور قرآن شریف ہو تو ماتھے پر ایمان کی چمک، ان کا یہی جملہ مولانا دریابادی کا فلسفۂ حیات بن گیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے پروفیسر وہاج الدین علوی نے مولانا دریابادی کی شخصیت کی ہمہ جہتی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس پر مولانا نے قلم نہ اٹھایا ہو سیمینار کے مہمان خصوصی ڈاکٹر سعید الرحمان اعظمی ندوی، مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلما نے کہا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ انھوں نے معاشرے کو فیض پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ افسوس اس کا ہے کہ ہمارے اسکولوں کے نصاب میں ذہنی انقلاب کے علمبرداروں کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہماری نئی نسل مولانا کی شخصیت سے ناواقف ہے۔

اپنے صدارتی خطبے میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر محمد سلیم قدوائی نے کہا کہ مولانا کے نظریات اور خیالات آج بھی معنی خیز ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے مولانا عبدالماجد دریابادی کی تصنیف ''مولانا جوہر کی ذاتی زندگی کے چند اوراق'' کو ان کی سب سے اعلیٰ تصنیف قرار دیتے ہوئے مولانا دریابادی کی شخصیت پر مفصل روشنی ڈالی۔ سیمینار میں درجۂ ششم کے متعلم محمد مدثر سلیم نے بھی مولانا دریابادی کی حیات کارناموں اور فکر پر ایک پرچہ پڑھا۔ مولانا عمیر الصدیق ندوی رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ کا مقالہ ڈاکٹر تسخیر الحسن نے پڑھ کر سنایا۔ آخر میں رابطہ سیوا اسنستھان بارہ بنکی کے منیجر جناب محمد سلیم نے اظہار تشکر کیا۔ (ڈاک سے)

قاضی سجاد حسین کی علمی خدمات

● نئی دہلی۔ 17 مارچ، مولانا قاضی سجاد حسین نہایت خوش اخلاق اور خوش گفتار بزرگ تھے بڑے بڑے الجھے معاملات کو چٹکیوں میں حل کر لیا کرتے تھے۔ ان خیالات کا اظہار سید اوصاف علی نے مرکز علم و دانش نئی دہلی کے زیر اہتمام مولانا قاضی سجاد حسین: حیات و خدمات کے موضوع پر منعقدہ سیمینار غالب اکادمی میں کیا۔ وہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ قاضی صاحب کی خدمات کا دائرہ صرف اردو تک محدود نہیں ہے بلکہ انھوں نے فارسی زبان میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ قاضی صاحب نے گلستاں، بوستاں اور مثنوی مولانا روم جیسی کتابوں کا نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ مطالب و مقاصد کو بھی بحسن و خوبی بیان کیا۔ مسٹر اوصاف نے کہا کہ جامعہ ہمدرد کے قیام میں بھی قاضی سجاد کا نمایاں کردار ہے۔ یہ سیمینار بہت پہلے منعقد ہونا چاہیے تھا۔ سیمینار کے افتتاحی سیشن کی صدارت پروفیسر امیر حسن عابدی نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اس سیمینار کے موقع پر مولانا قاضی سجاد حسین کی کتابوں کی نمائش ہونی چاہیے تھی۔ انھوں نے کہا کہ فتاویٰ تاتارخانیہ کا کام مولانا کو اندرا گاندھی نے سپرد کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ آج ہندی کا رواج ہے اس کا تقاضہ ہے کہ اب کتابوں کا ترجمہ ہندی میں بھی کیا جائے۔ کتاب وہی مقبول ہوتی ہے جسے مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔ جس طرح ہم دیگر ممالک کے لٹریچر کو پڑھتے ہیں، ہمیں بھی اپنے لٹریچر کو ان تک پہنچانے کے لیے ان کی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیے۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر ابرار کرت پوری نے کی جبکہ خیر مقدمی کلمات ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی نے پیش کیے۔ اظہار تشکر پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر عبید الرحمٰن نے کہا کہ اس سیمینار کے ذریعے غالب اکادمی نے مولانا قاضی سجاد کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر ایم نجفی کلچرل کونسلر (ایران کلچرل ہاؤس) خواجہ حسن ثانی نظامی، ڈاکٹر مہدی خواجہ پیری اور محترمہ طلعت نسرین نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سیمینار کے اس سیشن کے افتتاح سے قبل کمال جعفری کی کتاب ''نعت و منقبت کے پھول'' کا اجرا پروفیسر امیر حسن عابدی کے ہاتھوں ہوا۔ اس موقع پر اہم علمی و ادبی شخصیات کے علاوہ مولانا قاضی سجاد حسین کے اہل خانہ بطور خاص موجود تھے۔ رفعت سروش نے اپنے مقالے میں مولانا قاضی سجاد کی حیات و

خدمات کا جائزہ لیا۔ جبکہ محترمہ ناہید تاج نے مولانا قاضی سجاد سے اپنے رشتے کی تفصیلات بتائیں اور ڈاکٹر عبدالعزیز نے مولانا قاضی سجاد پر اپنا خاکہ پیش کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ایک شام محبت کے نام

● نئی دہلی۔ 30 مارچ، اے ٹی ایس گروپ دہلی کے زیر اہتمام بہ تعاون اردو اکادمی ''ایک شام محبت کے نام'' منائی گئی صدارت صدر انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر سراج الدین قریشی نے کی اور نظامت معین شاداب نے کی۔ سابق وزیر بہار شائل نبی اور ابرار صدیقی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ سراج الدین قریشی، فادر سوسائے سبحین (چنتیالے) سریندر گجر، ستپال سنگھ چوہان بھارت (ایڈووکیٹ) نے شمع افروزی برائے قومی یکجہتی کی۔ مہمانانِ ذی وقار کی حیثیت سے ایم سلیم اور سلیم اختر خاں شریک ہوئے۔ ڈائیلاگ جناب گلزار دہلوی، کیول سود، ڈاکٹر ہریش نول نے پیش کیے۔ ایم سلیم، ایس ٹی رضا نے مہمانان کا استقبال کیا۔ فنکشن کا افتتاح ڈائرکٹر ایران کلچرل ہاؤس ڈاکٹر عبدالحامد ضیائی نے کیا، انھوں نے کہا کہ محبت کے نام مجلس کا انعقاد بہتر قدم ہے، اس طرح کے اقدام محبت اور بھائی چارہ میں اضافہ کرتے ہیں۔ محبت ایوارڈ یافتگان میں، چترا سنہا کو سماجی خدمت گار، عمیر از الیاسی کو ماہر اسلامیات، ڈاکٹر ہرش وردھن کو پولیو اسپیشلسٹ، ڈاکٹر عبدالحامد ضیائی کو کلچر ایکسپرٹ، شکیل حسن شمسی کو شاعر، اشوک ساہنی کو سماجی خدمتگار اور روی شرما کو صحافی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ یہ ایوارڈ وزیر صحت دہلی سرکار ڈاکٹر یوگانند شاستری نے پیش کیا۔ وزیر صحت نے کہا کہ ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی نے اتحاد و اتفاق اور یکجہتی کی بنیاد پر ہی اس ملک کو آزاد کرایا۔ لہٰذا محبت اور بھائی چارے میں مزید اضافے کی ضرورت ہے۔ صدارتی کلمات میں سراج الدین قریشی نے اس عمل کو سراہا اور منتظمین کو مبارکباد دی۔ صدر اے ٹی ایس گروپ طالب رامپوری نے تمام مہمانوں کا استقبال و تعارف پیش کیا۔ منتخب اشعار کا مجموعہ ''خوشبوئے چمن'' انتخاب کردہ اشوک ساہنی کا مہمانان کے ہاتھوں اجرا بھی ہوا۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں علمی، سیاسی، ادبی اور سماجی شخصیات نے شرکت کی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ہریانہ اردو اکادمی کے انعامات کا اعلان

● پنچکولہ۔ ہریانہ اردو اکادمی کی ایوارڈ کمیٹی کی میٹنگ جناب مانگے رام گپتا، وزیر تعلیم ہریانہ کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں حسب ذیل قلم کاروں کو ان کی ادبی خدمات کے لیے ایوارڈ سے نوازنے کا فیصلہ لیا گیا۔

1. حالی ایوارڈ جو ایک لاکھ روپے، شال مومنٹو اور توصیفی سند پر مشتمل ہوتا ہے، حکیم اجمل خاں (شکروالا، میوات) کو دینے کا فیصلہ لیا گیا۔ 2. کنور مہندر سنگھ بیدی سماجی و ثقافتی ایوارڈ جو پچیس ہزار روپئے، شال مومنٹو اور توصیفی سند پر مشتمل ہے، جناب رفعت سروش (دہلی) کو دینے کا فیصلہ ہوا۔ 3. بہبودی خواتین کے لیے صابر دت ایوارڈ جو پچیس ہزار روپئے، شال مومنٹو اور توصیفی سند پر مشتمل ہے، ڈاکٹر ساجد زیدی (دہلی) کو دیا جائے گا۔ 4. شاعری کے لیے سید مظفر حسین برنی ایوارڈ جو اکیس ہزار روپئے، شال مومنٹو اور توصیفی سند پر مشتمل ہے، پروفیسر ستیہ پرکاش شرما تفتہ (کورکشیتر) کو دیا جائے گا۔ 5. اردو نثر کے لیے خواجہ احمد عباس ایوارڈ جو اکیس ہزار روپئے شال مومنٹو اور توصیفی سند پر مشتمل ہے، ڈاکٹر ویس راج سپرہ (شاہ باد مارکنڈہ) کو دیا جائے گا۔ 6. اردو فکشن کے لیے منشی گمانی لال ایوارڈ جو گیارہ ہزار روپئے، شال مومنٹو اور توصیفی سند پر مشتمل ہے، محترمہ شافعہ شاد (فرید آباد) کو دیا جائے گا۔ 7. انبالہ کے گردونواح میں اردو کے فروغ کے لیے سریندر چندت سوز ایوارڈ جو پانچ ہزار روپئے، شال مومنٹو اور توصیفی سند پر مشتمل ہے، ڈاکٹر سویتا ملہوترہ کو دیا جائے گا۔ 8. ہریانہ اردو اکادمی کے ضابطے کے مطابق اکیس سو روپئے، شال اور ایک توصیفی سند پر مشتمل ایوارڈ، جناب مدن مہلوی (کورکشیتر) ڈاکٹر کندن ارادلی (گوڑگاؤں) اور جناب آزاد سونی پتی (سونی پت) کو دیا جائے گا۔

علاوہ ازیں ہریانہ میں اردو کی ترقی کے لیے کچھ اور ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا جن میں بچوں کے ادب کی تیاری کے لیے ان قلم کاروں کو بالترتیب اکتیس ہزار، اکیس ہزار اور گیارہ ہزار روپئے کے انعامات سے نوازا جائے گا جو ایویلو ایشن کمیٹی کی رپورٹ کے بعد پہلا دوسرا اور تیسرا درجہ حاصل کریں گے۔

ہریانہ اردو اکادمی اس سال سے فاصلاتی سرٹیفکیٹ/ڈپلوما کورس کا اہتمام بھی کرے گی جس میں طلبہ کے لیے عمر کی کوئی حد بندی نہیں ہوگی۔ پہلی سے پانچویں جماعت کے طلبہ کے لیے اکادمی کی جانب سے خصوصی طور پر نصابی کتابیں تیار کروائی جائیں گی اور اس کام کے لیے قابل مصنفین کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔

مذکورہ میٹنگ میں یہ فیصلہ بھی ہوا کہ فیروز پور نمک، میوات سے ٹرینڈ اردو اساتذہ کی تقرریاں میوات کے سبھی پرائمری سرکاری اسکولوں میں کی جائیں گی جس کے لیے مئی 2008 میں نوح میں ایک جلسہ منعقد کیا جائے گا جس میں اردو اساتذہ کو مدعو کرکے وہیں پر انھیں تقرری کے احکامات جاری کیے جائیں گے۔ (ڈاک سے)

پروفیسر اے ایم پٹھان کو کرناٹک اردو اکادمی کا ایوارڈ

● حیدرآباد۔ 25 مارچ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس

چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان کو کرناٹک اردو اکادمی نے اردو کے تئیں بے مثال خدمات کے اعتراف میں سال 08-2007 کا سالانہ ایوارڈ برائے مجموعی خدمات تفویض کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اکادمی کے چیئرمین پروفیسر م.ن سعید نے پروفیسر پٹھان کے نام ایک مکتوب میں یہ اطلاع دیتے ہوئے انھیں اکادمی اور ریاست کے اہل اردو کی طرف سے مبارکباد پیش کی ہے اور کہا ہے کہ اس اعزاز کے لیے آپ کے انتخاب سے اکادمی کے اعزازات کا رتبہ بلند ہوا ہے۔ واضح رہے کہ کرناٹک اردو اکادمی نے مجموعی خدمات کے علاوہ شاعری، نثر، صحافت اور تعلیمی خدمات کے میدانوں میں بھی اعزازات کا اعلان کیا ہے۔ یہ اعزازات ایک شان دار تقریب میں بنگلور میں دیے جائیں گے۔

(آزاد ہند، کلکتہ)

ایک شام کلیم عاجز کے نام

● رانچی۔ 5 مارچ، بروز بدھ گرونانک کمیونٹی ہال میں رابطۂ ادب اسلامی جھارکھنڈ کے زیر اہتمام ایک ادبی تقریب ''ایک شام کلیم عاجز کے نام'' کا انعقاد کیا گیا تقریب کی صدارت عالمی رابطۂ ادب اسلامی کے صدر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے فرمائی۔ اس موقع پر جناب کلیم عاجز کو رابطۂ ادب اسلامی جھارکھنڈ کی جانب سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایوارڈ بدست مولانا رابع حسنی ندوی پیش کیا گیا۔ شریف احسن مظہری نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ جس میں جھارکھنڈ کی ادبی ثقافتی خدمات کے ساتھ ساتھ اس کے قدرتی مناظر کا ذکر کیا۔ رابطۂ ادب اسلامی کے سکریٹری اور اس تقریب کے بانی مولانا آفتاب عالم ندوی نے ڈاکٹر کلیم عاجز کی شخصیت اور شاعری پر مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر عاجز کی شخصیت و شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے جناب عاجز کی شاعری کو حافظ شیرازی کی طرح صدائے غمزدگاں اور سخن دلہائے مرداں قرار دیا۔ اس موقع پر متعدد دانشوران ملت نے عاجز کی شخصیت و شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کی ادبی ولسانی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ خصوصی طور پر مولانا سید واضح رشید ندوی سکریٹری عالمی رابطۂ ادب اسلامی جناب اسلم بدر، ڈاکٹر احمد شمیم، جناب ڈاکٹر احمد سجاد ڈاکٹر انوار احمد خاں، ڈاکٹر جاوید احمد اور جناب صدیق مجیبی نے سامعین کو خطاب کیا۔

اس ادبی و ثقافتی پروگرام میں ایک شعری نشست کا بھی انعقاد کیا گیا۔ جن شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا۔ وہ تھے جناب اسلم بدر، جناب صدیق مجیبی، جناب حیرت فرخ آبادی، جناب سرور ساجد اور جناب سہیل سعید۔ مولانا عبدالکریم قاسمی، عبدالودود ندوی اور محمد فاروق میرٹھی نے کلام عاجز کو خوش گلوئی کے انداز میں پیش کرکے داد و تحسین حاصل کی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر کلیم عاجز نے بھی اپنی نظمیں سنا کر سامعین سے خوب خوب داد و تحسین کے نذرانے قبول کیے۔

رابطۂ ادب اسلامی کے عالمی صدر اور اس بزم کو اپنی صدارت سے رونق بخشنے والے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے اپنے صدارتی خطبے میں رابطۂ ادب اسلامی کے اغراض و مقاصد اور اس تحریک کی عالمی خدمات پر اظہار خیال کیا نیز ڈاکٹر کلیم عاجز کی علمی و ادبی خدمات اور ان کی شاعرانہ عظمت کو خراج تحسین پیش کیا۔ تقریب کے اختتام پر مولانا ضیا الہدیٰ اصلاحی نے شرکائے اجلاس کا شکریہ ادا کیا۔ اس تقریب میں رانچی، جمشید پور اور دھنباد کے متعدد علما اور دانشوروں نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● حیدرآباد۔ 7 مارچ، اوساکا یونیورسٹی جاپان کے وزیٹنگ پروفیسر اور سابق صدر شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی، پاکستان پروفیسر معین الدین عقیل نے کہا کہ مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کا شعبۂ ترجمہ دنیا بھر میں منفرد نوعیت کا حامل ہے جہاں ترجمے کا کام بھی ہوتا ہے اور ترجمے کی اعلیٰ تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ تدریسی سطح پر ترجمے کا فروغ بہتر مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ انھیں بہت سی جامعات اور کتب خانوں میں جانے کا اتفاق ہوا لیکن ایسے کسی شعبے کا علم نہیں ہوا جو تدریس و ترجمہ دونوں ہی کاموں کے لیے مخصوص ہو۔ انھوں نے آج یہ بات یہاں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں شعبۂ ترجمہ کے زیر اہتمام منعقدہ توسیعی لکچر کے دوران کہی جس کا موضوع ''اردو تراجم کا عالمی منظرنامہ'' تھا تقریب کی صدارت پرووائس چانسلر پروفیسر کے آر اقبال احمد نے کی۔

پروفیسر معین الدین نے ماضی کی طرف مراجعت کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی تراجم میں ایسے عالم شریک تھے جن کا عربی اور فارسی سے بہت گہرا اور قریبی رشتہ تھا لہٰذا وہاں کے تراجم مشکل ہوگئے۔ ممکن ہے کہ اس دور اور یہاں کے ماحول سے وہ تراجم مناسبت رکھتے ہوں لیکن پاکستان میں انھیں مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی۔ دراصل افہام اور ابلاغ کو سہل ترین بناتے ہوئے اصطلاح کی تشکیل ہونی چاہیے۔ ایسی اصطلاحیں جو زبان پر چڑھ سکیں، قبولیت حاصل کرسکیں اور گراں نہ ہوں، زیادہ موثر اور دیرپا ہوتی ہیں۔ انھوں نے تراجم میں تصور، خیال اور نظریے کی ترسیل کو بنیادی حیثیت دیتے ہوئے کہا کہ لفظی تراجم اور الفاظ میں الجھے ہوئے تراجم مقبول نہیں ہوتے۔ انھوں نے تحقیق اور ترجمے میں اجتماعیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ مغرب میں عام طور پر بڑے بڑے کام اجتماعی کاوشوں کا نتیجہ ہوتے ہیں جبکہ ہمارے یہاں عموماً

اجتماعی کوششیں اختلافات کا شکار ہو جاتی ہیں۔

صدر جلسہ پرووائس چانسلر پروفیسر کے آر اقبال احمد نے کہا کہ تصنیف و تالیف اور تخلیق کے میدانوں میں سب سے مشکل کام ترجمہ ہے۔ مشینی تراجم کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ مشین کے ذریعے دستاویزات کا ترجمہ تو ہو سکتا ہے لیکن پیار، محبت اور غم و غصہ جیسے جذبات کا ترجمہ بھلا کیسے کیا جا سکتا ہے۔ صدر شعبۂ ترجمہ پروفیسر محمد ظفر الدین نے مہمانوں کا استقبال کیا اور یونیورسٹی اور شعبۂ ترجمہ کا تعارف کرایا جبکہ جناب فہیم الدین احمد لکچرر شعبہ ترجمہ نے مہمان مقرر کا تعارف کرایا۔ ریڈر شعبہ ترجمہ ڈاکٹر خالد مبشر الظفر نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور جناب جنید ذاکر لکچرر شعبہ ترجمہ نے شکریے کی رسم ادا کی۔ پروفیسر ریحانہ سلطانہ ڈاکٹر فہیم اختر ندوی، ڈاکٹر فیروز عالم وغیرہ نے سوالات کیے۔ (ڈاک سے)

● شاہجہاں پور۔ 3 مارچ 2008، 7 بجے شام صوبائی حکومت کی جانب سے محترمہ ترنم عقیل صاحبہ کو چیئرپرسن اتر پردیش اردو اکادمی نامزد کیے جانے پر قومی تخلیق فاؤنڈیشن کی جانب سے ایک استقبالیہ تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ تقریب کی صدارت انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر آشیش کمار میسی نے فرمائی۔ سب سے پہلے مہمان خصوصی محترمہ ترنم عقیل کو گلدستہ اور شال پیش کر کے ہدیۂ تہنیت پیش کیا گیا۔ دیگر معزز مہمانان ارون کمار ساگر، قاضی شہر، سید مسعود حسن اور مشہور شاعر نسیم شاہجہاں پوری، جناب وسیم مینائی اور جناب اسرار نسیمی کی بھی گل پوشی ہوئی اور شالیں پیش کی گئیں۔ نسیم شاہجہاں پوری نے مہمان خصوصی ترنم عقیل کو چیئرپرسن کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہونے پر دلی مبارکباد دی۔ موصوفہ نے جناب وسیم مینائی کی تصنیف ''میری زمین کے قلم کار اور تہذیبی کردار'' اور جناب اسرار نسیمی بریلوی کے مجموعۂ کلام ''لفظوں کی روشنی'' کا اپنے دست مبارک سے تالیوں کی گونج میں اجرا فرمایا۔ اس کے بعد موصوفہ نے کہا کہ اردو کی ترقی کے لیے کسی کے تعاون اور مدد کے بغیر اس کے پرستاروں کی مشترکہ اور مسلسل کوششوں کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ شاہ جہاں پور شہر اردو ادب کا گہوارہ ہے یہاں اردو کے خادموں، شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کی کمی نہیں ہے۔ موصوفہ کے بعد مہمان اعزازی ارون کمار اور قاضی شہر سید مسعود حسن نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ قاضی شہر نے وسیم مینائی کی ادبی شعری و صحافتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے نامساعد حالات کے باوجود اردو ادب میں شاہجہاں پور کی ایک پہچان بنائی ہے۔

تقریب کے صدر ڈاکٹر آشیش میسی نے اپنی تقریر میں کہا کہ غزلیں سب کا دل جیت لیتی ہیں۔ عالمی سطح پر اردو کی مقبولیت روز افزوں ہے آخر میں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ جن شعرا نے اپنے کلام سے نوازا ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔ نسیم شاہجہاں پوری، عتیق حسن خاں صبا، ناز پرتاپ گڑھی، حکمت شاد، وسیم مینائی، عظیم شاہجہاں پوری، اسرار نسیمی بریلوی، سعید بریلوی، ثروت پرویز، عبدالقدیر مسرور، ذاکر علی عرش، ڈاکٹر امن تلیاپوری، ندرت حامدی۔ آخر میں پروگرام کے کنوینر انجم ضیا اور احسان الحق نے سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

● 27 فروری بمقام امر سنگھ کلب جموں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ کشتواڑ کی طرف سے ایک ادبی تقریب کا انعقاد دو نشستوں میں ہوا۔ پہلی نشست میں ریاست جموں و کشمیر سے وابستہ معروف اردو شاعر جناب پرتپال سنگھ بیتاب کو، اردو کے تئیں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ایک عدد شال، ٹرافی اور اعزازی سند بعنوان ''محسن اردو'' سے سرفراز کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمانانِ مکرم میں پدم بھوشن جناب بلراج پوری، پروفیسر ظہور الدین، جناب دیپک بدکی اور پنجابی کے کہانی کار جناب خالد حسین مجلس صدور میں جلوہ افروز تھے۔

دوسری نشست کل ہند مشاعرے پر مشتمل تھی جس میں جناب منشاء الرحمن خاں منشا، جناب پریم کمار نظر، جناب نذیر فتح پوری، جناب عکس لکھنوی، جناب پرتپال سنگھ بیتاب، جناب ظفر اقبال، ڈاکٹر پریمی رومانی، جناب عشاق کشتواڑی، جناب کرشن کمار طور، جناب شفق سوپوری، جناب دیپک آرسی، محترمہ روبینہ شبنم، محترمہ نسرین نقاش، محترمہ شبنم عشائی، جناب بلراج بخشی، جناب محبوب راہی، جناب شام طالب، جناب بیتاب جے پوری، جناب زاہد مختار، محترمہ نکہت فاروق نظر کے علاوہ دیگر کئی کلام سنایا۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض جناب زاہد مختار نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

● چنئی۔ 26 مارچ 2008 کو جے بی اے ایس کے شعبۂ اردو نے ریاستی سطح پر اپنا پانچواں بین الکلیاتی تقریری مقابلہ منعقد کیا۔ یہ مقابلہ محسن فاطمہ اختر صاحبہ کی یاد میں منعقد کیا جاتا ہے۔ ریاست تامل ناڈو کے مختلف کالجوں کے طلبہ اور طالبات نے اس مقابلے میں حصہ لیا اس مباحثے کا موضوع تھا ''مسلمانوں کی ترقی کے لیے صحیح معنوں میں رہنمائی کس نے کی علامہ اقبال نے یا سر سید احمد خاں نے؟'' اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے ہر طالب علم کو 7 منٹ دیے گئے۔

مہمان خصوصی کی حیثیت سے اس تقریب کی رونق بڑھائی تھی جناب محمد یعقوب اسلم نے جو کئی درسی کتابوں کے مصنف اور معروف شاعر ہیں۔ ممبران جیوری تھے ڈاکٹر حیات افتخار، صدر شعبۂ اردو قائد ملت آرٹس کالج تندم اور ڈاکٹر قاضی حبیب سینئر لیکچرر مدراس یونیورسٹی۔

مقابلہ بڑا ہی دلچسپ رہا۔ طالب علموں کی تقریریں بڑی پُر اثر تھیں۔

تقریباً دو گھنٹوں کے بعد مقابلے اور پھر نتیجے کا اعلان ہوا۔ اس بین الکلیاتی مباحثے کا پہلا انعام جسٹس بشیر احمد سعید کالج کی ٹیم کو ملا۔ جو' طالبات پر مشتمل تھی مس نصرت جہاں اور مس شائستہ عشرت نیم پرائز کے طور پر فی کس -/750 نقد رقم اور رولنگ شیلڈ دی گئی۔ دوسرا انعام اسلامیہ کالج وانمباڑی کو ملا جس میں -/600 کی رقم ہر طالب علم کو ملی۔ تیسرا انعام مظہر العلوم کالج آمبور کے طلبہ کو ملا۔ جس میں -/500 روپئے کی رقم ہر طالب علم کے حصے میں آئی۔ چوتھا انعام سی عبدالحکیم کالج آمبور کو ملا۔ -/300 روپئے ہر طالب کے حصے میں آئے۔ تمام شرکائے مقابلہ اور انعام یافتہ طلبہ کو اسناد پیش کی گئیں۔

دونوں جلسوں میں کالج کی مجلس انتظامیہ کے چیئرمین جناب موسیٰ رضا صاحب، سکریٹری جناب کمال الدین فخری صاحب، کرسپانڈنٹ جناب فیض الرحمٰن سعید صاحب اور پرنسپل محترمہ سنجیدہ صاحبہ کا بھرپور تعاون شامل رہا۔ ایوننگ کالج کی صدر شعبۂ اردو مسز بشیرہ سلطانہ نے ادائے تشکر کا فریضہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

● جسٹس بشیر احمد سعید کالج کے شعبۂ اردو کی طرف سے امتہ الحلیم پرائز انڈومنٹ کے تحت نظم خوانی کا مقابلہ ہر سال منعقد کیا جاتا ہے۔ جس کے تحت طالبات علامہ اقبال اور مولانا الطاف حسین حالی کی نظمیں اور غزلیں تحت اللفظ اور ترنم میں سناتی ہیں اور ان کی بہترین کارکردگی پر انھیں انعامات دیے جاتے ہیں۔ اس سال یہ جلسہ 20 مارچ 2008 کو منعقد کیا گیا۔ جلسے کا آغاز قرآن کریم کی آیاتِ مطہرہ کی تلاوت سے ہوا اور پھر شعبۂ اردو کی صدر ڈاکٹر ذاکرہ اُم شہلا نے اپنی استقبالیہ تقریر میں اس کالج کے بانی مرحوم جسٹس بشیر احمد سعید اور ان کی اہلیہ بیگم فاطمہ اختر صاحبہ مرحومہ کی روحوں کو خراجِ تحسین و عقیدت پیش کیا نظم خوانی کے اس مقابلے میں معروف ادیب و شاعر جناب علیم صبانویدی بہ حیثیت مہمان خصوصی شریک تھے، محترمہ ڈاکٹر آصفیہ شاکر صدر شعبۂ اردو پریسڈنسی کالج چینئی اور محترمہ بدرالنسا صدر شعبۂ اردو بھارتی ویمنس کالج چینئی، کو مقابلے کی کارروائی چلانے کی ذمے داری سونپی گئی۔ مقابلے کے خاتمے پر ممبرانِ جیوری نے اپنے اپنے تاثرات پیش کیے اور مہمانِ خصوصی جناب علیم صبانویدی نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے اور پھر نتیجے کا اعلان ہوا۔ مولانا الطاف حسین حالی کی نظمیں اور غزلیں تحت اللفظ میں سنانے والی طالبات کو اول، دوم و سوم انعامات دیے گئے۔ مولانا الطاف حسین حالی کی نظمیں اور غزلیں ترنم میں سنانے والی طالبات کو بھی انعامات سے نوازا گیا۔ علامہ اقبال کی مختلف نظمیں اور غزلیں بھی باری باری تحت اللفظ میں اور پھر ترنم میں سنائی گئیں اور بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والی طالبات کو انعامات تقسیم کیے گئے۔ کل بارہ انعامات کی تقسیم کے بعد یہ جلسہ محترمہ بشیرہ سلطانہ کے اظہارِ تشکر کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔ (ڈاک سے)

● اسلامیہ کالج وانم باڑی نے سابقہ روایات کے مطابق اس سال 17 مارچ 2008 کو ''جشنِ اردو'' منایا۔ اس سال مولانا جلال الدین رومی کی ولادت پر آٹھ سو سال مکمل ہوئے ہیں، اس مناسبت سے دنیا کے اکثر ممالک میں عارف رومی کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا جا رہا ہے۔ مغربی ممالک میں بھی عارف رومی کی انسانیت نواز، عالمگیر مساوات و اخوت اور وحدت و عظمتِ آدمیت کی حامل تعلیمات کی پذیرائی اور قدردانی ہو رہی ہے۔ اسلامیہ کالج وانم باڑی نے عارف رومی کے آٹھ سو سالہ جشن ولادت کے سلسلے میں ایک روزہ سیمینار کا اہتمام کیا جس کی صدارت ڈاکٹر قاضی صلاح الدین محمد ایوب نے کی اور اپنے خطبۂ صدارت میں حضرت رومی کی زندگی کے مختلف گوشوں کو نمایاں کیا۔ اس کے بعد تمل ناڈو کے ممتاز صاحب قلم حضرات نے اپنے مقالات پیش کیے۔

ڈاکٹر راہی فدائی نے ''عہد حاضر میں مثنوی مولانا روم کی معنویت'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر حافظ بشیر الحق قریشی نے ''مولانا روم اور تصوف'' کے عنوان سے مقالہ سنایا۔ ڈاکٹر قاضی حبیب احمد نے ''مولانا روم کے کلام میں اخلاقیات'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا اور مولانا نور احمد بیگ باقوی نے ''رومی کی حیات و خدمات'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ صدر اجلاس کی دعا پر یہ مذاکراتی مجلس بحسن وخوبی اختتام پذیر ہوئی۔ (ڈاک سے)

● شعبۂ اردو میسور یونیورسٹی میں ''اردو شاعری حسرت تا حال— تجزیہ و تفہیم'' کے عنوان سے ایک سہ روزہ ورک شاپ کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں مختلف ریاستوں کے دانشور شریک رہے۔ پروفیسر مسعود سراج صدر شعبۂ اردو میسور یونیورسٹی نے سہ روزہ ورکشاپ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر عتیق اللہ (دلی) نے فن پارے کے تجزیے کی نوعیت اور طریق کار پر گفتگو کی۔ انھوں نے فرمایا کہ مجھے خوشی ہے کہ شعبۂ اردو میسور یونیورسٹی نے ہندوستان میں پہلی بار اس نوعیت کی ورکشاپ کا انعقاد کیا ورنہ ہماری توجہ زیادہ تر سیمیناروں پر رہی۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ جب یہ تجزیے اشاعت پذیر ہوں گے تو اس سے اساتذہ اور طلبہ دونوں یکساں مستفیض ہوں گے۔ اس ورکشاپ کا افتتاح ڈاکٹر م.ن. سعید (بنگلور) کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ ڈاکٹر محمد ضیاء اللہ کے شکریے پر افتتاحی اجلاس اختتام پذیر ہوا۔ اس ورکشاپ میں بحیثیت ماہرین پروفیسر محمد انوارالدین، ڈاکٹر نسیم الدین فریس، پروفیسر سلیم شہزاد، پروفیسر حمید سہروردی، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے شرکت کی۔

(ڈاک سے)

● انجمن محبانِ اردو گورکھپور کی ساتویں ماہانہ نشست زیر صدارت سیّد نورالحسن ناصر لائبریری گورکھپور میں منعقد ہوئی۔ پروگرام کا آغاز مولانا فضل الرحمٰن انظر قاسمی کی تلاوت سے ہوا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر مظہر عباس تھے۔

نظامت کے فرائض مولانا انظر قاسمی نے انجام دیے۔ نشست میں اراکینِ انجمن کی فروغ اردو کے لیے کوششوں کا ذکر ہوا۔ دسویں اور بارھویں کے طلبہ و طالبات کے اردو پرچوں کی بہتر تیاری اور مفت اردو کوچنگ کے لیے اسلامک اکادمی فار چلڈرن نظام پور اور مولانا آزاد ہائر سیکنڈری اسکول گورکھناتھ کو مرکز بنا کر تجربہ کار اساتذہ ڈاکٹر درخشاں تاجور، ڈاکٹر سلمیٰ بانو، طارق شفیق ندوی اور سیّد فرید احمد صاحبان کی خدمات حاصل کی گئیں۔

موسم گرما کی چھٹیوں میں اردو نہ جاننے والے طلبہ اور طالبات کے لیے ایک آسان اور مفید نصاب کا نظم 15 اپریل سے کیے جانے کی تجویز سامنے آئی جس کی تیاری کے لیے ایک آٹھ رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی۔

روشن صدیقی نے تمام شرکا مجلس نیز اردو مفت کوچنگ کے مراکز کے انتظامیہ نیز دیگر معاونین ومحسنین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

● بھوپال۔ ساہتیہ اکادمی کے علامہ اقبال ساہتیہ پربھاگ کے ذریعے ہر سال قومی سطح پر علامہ اقبال پر مرکوز تحریری مقابلہ منعقد کیا جاتا ہے۔ اس سال ''علامہ اقبال اور بچے'' کا موضوع دیا گیا تھا اور ملک بھر کے کالجوں اور جامعات سے مقالات منگوائے گئے تھے۔

سندھی اکادمی کے ڈائرکٹر اور اقبال ساہتیہ پربھاگ کے ڈپٹی ڈائرکٹر جناب جھموں چھگانی اور ساہتیہ اکادمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر دیویندر دیپک نے مشترکہ بیان میں کہا کہ ''اقبال اور بچے'' موضوع پر موصول ہوئے مقالات میں دو ہزار روپئے کا پہلا انعام دہلی یونیورسٹی، دہلی کے محمد ارشد نے حاصل کیا۔ ایک ہزار پانچ سو روپئے کا دوسرا انعام گلبرگہ یونیورسٹی کرناٹک کی آنسہ فرحین بیگم نے حاصل کیا۔ ایک ایک ہزار روپئے کے تین خصوصی انعام گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ کی کنیز بیگم، حیدرآباد یونیورسٹی کے محمد احتشام الحق اور دہلی یونیورسٹی کے نور عالم اعظمی نے حاصل کیے۔ اس مقابلے کی جیوری میں پروفیسر ضمیر الدین، جناب گھنشیام تومر اور پروفیسر آفاق احمد شامل تھے۔

(ڈاک سے)

مشاعرے

● نئی دہلی۔ 30 مارچ، دہلی کی گنگا جمنی تہذیب کی امین اور ادبی روایات کی پاسدار شنکر لال مرلی دھر میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام گذشتہ رات آنجہانی شنکر لال شنکر اور لالہ مرلی دھر شاد کی یاد میں سرشنکر لال ہال ماڈرن اسکول میں 45ویں سالانہ شنکر و شاد مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت بیکل اتساہی اور نظامت ملک زادہ منظور احمد نے کی۔ معروف اداکارہ شبانہ اعظمی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ مہمانانِ ذی وقار میں مرکزی وزیر شکیل احمد اور نئی دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر شاہد ملک شامل تھے۔ سامعین میں دہلی اسمبلی میں ڈپٹی اسپیکر شعیب اقبال، قومی اقلیتی کمیشن کے سابق چیئرمین پروفیسر طاہر محمود، سابق ممبر پارلیمنٹ سید شہاب الدین، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی، سابق وزیر ظفر علی نقوی، ساہتیہ اکادمی کے سابق صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ، ہمایوں ظفر زیدی وغیرہ شامل تھے۔ مشاعرہ رات دو بجے کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔ شریک شعرا تھے۔ بیکل اتساہی، احمد فراز، زہرہ نگاہ، جاوید اختر، ڈاکٹر شہریار، گوپال داس نیرج، ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر وسیم بریلوی، گلنار آفریں، حبیب ہاشمی، تبسم نکہت، اعجاز پاپولر، ابراہیم اشک، انجم رہبر، ملک زادہ جاوید، سنیل کمار تنگ، طاہر فراز، شبینہ ادیب۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● شعبۂ اردو میسور یونیورسٹی میسور اور انجمن حدیقۃ الادب میسور کے اشتراک سے 19 مارچ 2008 بمقام میسکو آڈیٹوریم میں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت ممتاز شاعر اور نقاد پروفیسر عتیق اللہ (دہلی) نے فرمائی اور نظامت کے فرائض جناب گوہر تریکروی نے انجام دیے۔ مقامی شعرا میں پروفیسر مسعود سراج، مسعود ادیبی، اثر سعید، عرفان ریاضی، راحل خلیل بے باک اور گوہر تریکروی نے اپنا کلام سنا کر سامعین کو محظوظ فرمایا اور بیرونی شعرا میں نسیم الدین فریس (حیدرآباد) حمید سہروردی (گلبرگہ)، سلیمان اطہر جاوید (حیدرآباد)، سلیم شہزاد (مالیگاؤں) اور پروفیسر عتیق اللہ (دہلی) نے اپنا کلام سنایا۔

آخر میں پروفیسر عتیق اللہ نے اپنے صدارتی کلمات میں مشاعرے کی کامیابی پر پروفیسر مسعود سراج اور ان کے رفقا کو سراہا اور کہا کہ آپ کی بدولت یہ ممکن ہوسکا کہ ہماری رسائی شہر میسور کے باذوق سامعین تک ہوئی۔ انجمن کے معتمد سید شفیع احمد موظف ایگزیکٹیو انجینئر کے شکریے پر یہ یادگار مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔ (ڈاک سے)

● علی گڑھ۔ 18 مارچ، سرونج مدھیہ پردیش سے تشریف لائے عہد حاضر کے ممتاز شاعر ادیب، صحافی اور سہ ماہی انتساب کے مدیر ڈاکٹر سیفی سرونجی کی علی گڑھ آمد پر آذر اکادمی علی گڑھ کے زیر اہتمام شعری نشست کا اہتمام ابن سینا اکادمی، تجارہ ہاؤس دودھ پور علی گڑھ میں کیا گیا۔ جس کی صدارت ابن سینا اکادمی کے سربراہ پدم شری پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے کی۔ بحیثیت مہمان خصوصی پروفیسر زاہدہ زیدی اور ڈاکٹر معظم علی خاں معظم نے شعری نشست کے وقار میں اضافہ کیا۔ سہ ماہی انتساب کے سرپرست مسٹر اقبال اگروال اور مارہرہ سے آئے شارق عدیل بھی شریک بزم تھے۔ نظامت اویس جمال شمسی نے کی۔ حکیم سید ظل الرحمٰن نے ڈاکٹر سیفی سرونجی کی علی گڑھ آمد پر دل کی گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ سرونج جیسی جگہ میں اردو کا یہ مجاہد اپنی جہد مسلسل سے اردو کا آفتاب روشن کر رہا ہے۔ موصوف نے آذر

اکادمی کی جانب سے ڈاکٹر سیفی سرونجی کو توصیف نامہ، شال اور یادگاری نشان پیش کیے۔ نشست کا آغاز ڈاکٹر ظہیر احمد ساحل نے ہدیہ نعت سے کیا۔ درج ذیل شعرا نے محفل کی رونق بڑھائی۔ پروفیسر زاہدہ زیدی، ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی، ڈاکٹر سراج اجملی، ڈاکٹر سیفی سرونجی، ڈاکٹر معظم علی خاں، شارق عدیل، خالد ندیم، ارشد منصور غازی، ڈاکٹر زویا زیدی، اویس جمال شمسی، نعیم شیروانی، مشرف حسین محضر، ڈاکٹر عرفان انصاری، ڈاکٹر رضوان الرضا رضوان، وسیم اختر، ایم مبشر قمر، محمد صدیق عالم، ڈاکٹر ظہیر احمد ساحل۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 31 مارچ، اے ٹی ایس گروپ دہلی کے زیر اہتمام اردو اکادمی کے تعاون سے ایک مشاعرہ بعنوان ''ایک شام محبت کے نام'' کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت تنویر دمنی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ اردو اکادمی کے سکریٹری سید مرغوب حیدر عابدی نے شمع روشن کرکے مشاعرے کا افتتاح کیا۔ مشاعرے کے کنوینر ایم سلیم نے اظہار تشکر کیا۔ درج ذیل شعرا کا کلام خصوصیت سے پسند کیا گیا۔ تنویر دمنی، ملک زادہ منظور احمد، گلزار دہلوی، مخمور سعیدی، نصرت گوالیاری، کمال جعفری، طالب رامپوری، سریندر سنگھ شجر، شہباز ندیم ضیائی، اسد رضا، شکیل شمسی، ملک زادہ جاوید، س ش عالم، غفران فریدی، اشوک ساہنی، معین شاداب، اعجاز انصاری، رؤف رامش، جاوید مشیری۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● تاریخی شہر کٹک (اڑیسہ) میں گذشتہ 16 مارچ کو مقامی ''کلا وکاس کیندر'' ہال میں اردو ویب سائٹ ''محفلِ مشاعرہ'' کی جانب سے مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ مہمان خصوصی جناب مشتاق علی اور اعزازی مہمان، جناب داؤد الرحمٰن تھے۔ سینئر صحافی جناب عبدالرزاق قریشی بھی خصوصی دعوت پر تشریف فرما تھے۔ اس موقع پر اردو ویب سائٹ کے بانی جناب گوتم ہجرا گوتم کے اولین شعری مجموعے ''عرض کیا ہے'' کا ڈاکٹر مشتاق علی صاحب اور داؤد الرحمٰن صاحب نے اجرا کیا۔ واضح ہو کر جناب گوتم ہجرا گوتم کی مادری زبان بنگلہ ہے۔ مگر اردو زبان کی شیرینی و لطافت سے متاثر ہو کر انھوں نے اس زبان میں اتنی دست رس بہم پہنچائی کہ اب ان کا شمار اردو کے اچھے شاعروں میں ہے۔ ساتھ ہی وہ اردو کے فروغ کے لیے ہر ممکن سعی بھی کر رہے ہیں۔ ''عرض کیا ہے'' اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جناب ڈاکٹر مشتاق علی کی مرتب کردہ کتاب ''آؤ اردو سیکھیں'' کا اجرا جناب گھائل فریدی اور عبدالرزاق قریشی کے دست مبارک سے ہوا۔ یہ کتاب ہندی اور انگریزی کے ذریعے اردو سیکھنے والوں کے لیے ہے۔ مشاعرہ الحاج حبیب الرحمٰن حبیب کی نقابت اور لکھنؤ سے تشریف لائے مہمان شاعر قیصر وارثی صاحب کی صدارت میں ہوا۔ مشاعرے میں شرکت فرمانے والے شعرا تھے: جناب نعیم راشد (برہانپور)، جناب یوسف ساگر (بھلائی)، جناب گھائل فریدی (راجگانگپور)، جناب قیصر وارثی (لکھنؤ)، جناب شوق جالندھری (رائے پور)، جناب حبیب الرحمٰن حبیب (راجگانگپور)، جناب ساجد اثر (کٹک)، جناب سعید رحمانی (کٹک)، پاشا ندرت صاحبہ (کٹک)، جناب سمن نسیمی (بھدرک)، جناب شکیل دسنوی (کٹک)، جناب خنجر غازیپوری، (راؤرکیلا)، جناب گوتم ہجرا گوتم (کٹک) جناب نفیس دسنوی (کٹک)، جناب رفیق رضا (کٹک)، جناب ارشد جمیل (کٹک)، جناب شوکت رشیدی (کٹک)، جناب توفیق ساگر (بھدرک)، جناب ناظم قمر (کٹک)۔ (ڈاک سے)

رامپور۔ 17 مارچ، روہیلکھنڈ کلچر سوسائٹی کے زیر اہتمام رامپور کے استاد شاعر مرحوم بشیر علی خاں شکیب رامپور کی یاد میں مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے بزرگ شاعر حکیم علی خاں طرب ضیائی جبکہ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تشریف فرما تھے شریف الرحمٰن خاں۔ نظامت کے فرائض ثاقب رامپوری نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ مشاعرے میں درج ذیل شعرا نے شرکت کی۔ شاداب سید، وویک، جمشید نادم، اشفاق زیدی، نور وجہی، راشد سلطانی، طاہر کنول نعمانی، غفران فریدی، ثاقب رامپوری، احمد ضیائی، زبیر شاہ خاں فلک، افتخار طاہر، سید زبیر حسن زبیر، فرید نعمانی، ڈاکٹر فریدی صدیقی، فرید شمسی، طرب ضیائی۔ (صحافت، دہلی)

● نئی دہلی۔ 31 مارچ، شاہ جہاں آباد بی جی ایچ سوسائٹی کے زیر اہتمام دواریکا نئی دہلی میں ایک شعری نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت بزرگ شاعر مخمور سعیدی نے کی اور نظامت کے فرائض معروف شاعر و ادیب کمال جعفری نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے گیا، بہار سے آئے ہوئے معروف شاعر ناقد اور اردو جریدہ ''انتخاب'' کے مدیر پروفیسر علیم اللہ حالی نے شرکت کی۔ اس مخصوص نشست میں شریک شعرا تھے: مخمور سعیدی، علیم اللہ حالی، کمال جعفری، ڈاکٹر عبیدالرحمٰن، نور جہاں ثروت، وسیم اختر قادری اور ارشد کمال۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اجرا

● نئی دہلی۔ 17 مارچ، غالب جیسے عظیم شاعر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ایک غیر معمولی تخلیقی ذہن کے مالک تھے اور ان کا کلام زندگی کے بھید بھرے سنگیت سے معمور ہے۔ غالب نے ایک طرف جہاں نئی روشنی کے طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کو نئی زندگی کا استعارہ کہا تو دوسری طرف وہ مغلیہ تمدن کی روایتوں کے امین بھی تھے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام پون کمار ورما کی انگریزی کتاب "Ghalib: The Man The Times" کے ہندی ترجمے ''غالب اور ان کا یگ'' کی

رسم اجرا کرتے ہوئے کہا۔ گوپی چند نارنگ نے کہا کہ غالب نے اپنے ہم وطنوں کی تباہی و بربادی کا ماتم بھی کیا۔ خود ان کی پوری زندگی مصائب سے عبارت تھی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ غالب نے اپنی پوری محنت سے ''دستنبو'' کو تیار کیا جسے ''مرافعہ'' کہا گیا لیکن افسوس کی بات ہے کہ انھوں نے جس مقصد کے لیے مرافعہ کو اختیار کیا تھا اس میں انھیں کامیابی نہیں مل سکی۔ غالب کی شخصیت ان کے مزاج اور ان کے مخصوص حالات کے پس منظر میں پون کمار ورما کی کتاب ایک اہم کارنامہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ پون کمار ورما کی اس کتاب کا اردو ترجمہ ادارۂ ادبیات اردو (حیدرآباد) نے بہت پہلے شائع کیا تھا اور اس کا ہندی ترجمہ آج آپ کے سامنے ہے۔ یہ کتاب ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہے۔ اس موقع پر امریکہ میں ہندوستان کے سابق سفیر کبیر اور راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کے نائب صدر عابد حسین نے کہا کہ ان کو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ اپنی تمام تر دفتری مصروفیات کے باوجود پون کمار ورما نے اتنی اہم کتاب لکھی۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب سے غالب کی افہام وتفہیم میں بہت مدد ملے گی۔ کتاب کے مصنف پون کمار ورما نے کہا کہ میں غالب کا پرستار اور قدرداں ہوں۔ ان کی شخصیت اور ان کے مزاج اور ان کی دانشوری سے بے حد متاثر ہوکر میں نے اس کتاب کا ڈول ڈالا تھا۔ انھوں نے اس کتاب کی اشاعت کے لیے ساہتیہ اکادمی کا شکریہ ادا کیا۔ یاد رہے کہ پنگوئن اس کتاب کے 12 ایڈیشن شائع کرچکی ہے جبکہ ساہتیہ اکادمی نے اسے 16 زبانوں میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کتاب کی مترجمہ نشاط زیدی نے ترجمے کے درمیان درپیش پریشانیوں کا ذکر کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● مئو۔ 2 مارچ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اکیڈمک سنٹر کے زیر اہتمام نگر پالیکا پریشد ہال میں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی تصنیف ''اثر انصاری حیات اور خدمات'' کی رسم اجرا ڈاکٹر افتخار احمد اعظمی پرنسپل شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ نے ادا کی۔ ڈاکٹر افتخار احمد اعظمی نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا۔ ہندوستان کی تقسیم سے سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں خصوصاً اترپردیش کے مسلمانوں کا ہوا ہے۔ لیکن تقسیم کے بعد کے ابتر ترین حالات میں بھی انھوں نے صبر وضبط سے کام لیا۔ اللہ کا کرم ہے کہ 1970 کے بعد حالات بدلنے لگے اور آج کے ملٹی نیشنل کمپنیوں کے دور میں مذہب اور ذات برادری کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے اور زندگی کے تمام شعبوں میں باصلاحیت افراد کی ضرورت ہے لہٰذا مسلمانوں کو آج کے حالات کے پیش نظر تعلیم کے میدان میں آگے آکر اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور ملک وقوم کی تعمیر و ترقی میں اپنی حصے داری نبھانی چاہیے۔

رسم اجرا کی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر منور انجم نے اپنی تقریر میں مرحوم اثر انصاری کی علمی، ادبی، شعری اور سماجی خدمات پر روشنی ڈالی اور ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی تصنیف کو قابل تحسین کارنامہ بتایا۔ مولانا عمیر الصدیق، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، ڈاکٹر وکیل اشہر، مولانا انور علی، نذیر گرہست اور ڈاکٹر رفیق اشفاق نے کی اس موقعے پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر شکیل احمد نے مرحوم اثر انصاری کی تحریک آزادی میں گرانقدر خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی شایان شان یادگار قائم کرنے کا نگر پالیکا چیئرمین اور اراکین سے مطالبہ کیا۔ اس تقریب کی نظامت ماسٹر ابوالحسن نشتر نے انجام دی۔ (ڈاک سے)

وفات

پروانہ ردولوی

● یہ خبر اردو دنیا کے لیے باعث صد افسوس ہے کہ سید میثم تمار پروانہ ردولوی ابن سید غلام اصغر مرحوم 12 اپریل 2008 کو 77 سالہ زندگی گزار کر راہی ملکِ عدم ہوگئے اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم پروانہ ردولوی نے آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو پر چھائے گھٹاٹوپ اندھیرے میں قلم کے چراغ سے شاہراہ صحافت و ادب کو روشن رکھا اور تاحیات اردو کے حق کی لڑائی سپاہیانہ شان سے لڑتے رہے۔

مرحوم 18 سال کی عمر میں ہی یوپی اسمبلی میں اخبارات کے نمائندے مقرر ہوئے تھے اس کے بعد وہ تاعمر حلقۂ صحافت سے جدا نہ ہوئے۔ 1957 میں انھوں نے کانپور سے اپنا ایک اخبار ''سیاستِ نو'' بھی نکالا لیکن وہ بہت جلد بند ہوگیا۔ اس کے بعد وہ ''نئی دنیا'' سے وابستہ ہوگئے۔ ''نئی دنیا'' کے علاوہ انھوں نے روزنامہ ''ہندوستان'' بمبئی، روزنامہ ''دعوت'' دہلی، روزنامہ ''ملک وملت'' دہلی، روزنامہ ''قائد'' لکھنؤ اور روزنامہ ''پرتاپ'' دہلی میں اپنی صحافتی خدمات انجام دیں۔ پروانہ ردولوی نہ صرف صحافت بلکہ ادب کے میدان میں بھی اپنی شناخت قائم کرچکے تھے۔ ان کی تصنیفات درج ذیل ہیں:

☆اردو صحافت کا استغاثہ (تحقیق)، ☆جونک (افسانوی مجموعہ)، ☆نجات کا راستہ (اخلاقی تعلیمات)، ☆ہو بہو (معاصر ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے خاکے)، ☆آزمائش (سماجی ناول)، ☆ویرانی نہیں جاتی (رومانی ناول)، ☆کربلا سے کوفے تک (اسلامی تاریخ)، ☆شاہنامۂ کربلا (واقعات کربلا منظوم)، ☆کربلا کی بہادر خواتین (حضرت زینبؓ اور دوسری محترم خواتین کے حالات)، ☆قاتلانِ حسین کا عبرت ناک انجام (تاریخ)، ☆اسپین سے بوسنیا تک (تاریخ)، ☆ناسٹرڈامس کی سچی اور حیرت انگیز پیشین گوئیاں (اسراریات)، ☆جلیانوالہ باغ کا ہیرو (نیشنل بک ٹرسٹ کے لیے ترجمہ)، ☆ٹوڈا اینڈ ٹور (نیشنل بک ٹرسٹ کے لیے ترجمہ)، ☆انڈیا 2001 (ترجمہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)۔ □□□

تبصرہ و تعارف

● جامع تاریخ ہند

مصنفین: محمد حبیب/خلیق احمد نظامی

صفحات: 1000، قیمت: 306 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: ظفر احمد نظامی، 164۔ذاکر باغ، اوکھلا، نئی دہلی-110025

ہندوستان کی تاریخ نہایت دلچسپ ہے اور بڑے نشیب و فراز سے گزری ہے۔ پیش نظر کتاب کا پس منظر یہ ہے کہ 1940 میں انڈین ہسٹری کانگریس کے لاہور اجلاس میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ وہ ہندوستانی طلبہ کے لیے "A Comprehensive History of India" کے عنوان سے جدید ترین تحقیقات پر مبنی ایک کتاب تیار کرے لیکن اس کی تیاری اور تکمیل میں کئی برس صرف ہوگئے انجام کار بین الاقوامی شہرت یافتہ دو مورخین یعنی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر محمد حبیب اور پروفیسر خلیق احمد نظامی نے یہ عظیم کارنامہ انجام دے کر داد تحسین حاصل کی اور اس کا پہلا ایڈیشن 1984 میں منظر عام پر آگیا اور دوسرا ایڈیشن 2001 میں شائع ہوگیا جو ''عہد سلطنت'' پر مشتمل ہے۔

ہندوستان کی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے جن میں عہد قدیم 1206 تک کی مدت کا احاطہ کرتا ہے۔ 1206 سے 1857 تک کی مدت عہد وسطیٰ سے موسوم ہے اور 1857 سے 1947 کا زمانہ عہد جدید کہلاتا ہے۔ زیر نظر تاریخ 1206 سے 1426 کو محیط ہے جو اس دور سے متعلق معلومات کی کان ہے۔

اس کا پہلا باب ایشیائی ماحول سے متعارف کراتا ہے جس میں مسلمانوں کی بادشاہت اور امرا کے طبقے کے آغاز کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور خوارزمی سلطنت، چنگیز خاں کے عروج، عجم پر منگولوں کے حملے کے علاوہ امیر تیمور سے متعلق معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ دوسرا باب دہلی سلطنت کی بنیاد کے لیے وقف ہے جس میں محمد غوری کی تاریخ سے بحث کی گئی ہے اور شمالی ہندوستان کی فتح اور ترکی کے تسلط کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرے باب میں دہلی کے ابتدائی ترک سلاطین کا احاطہ کیا گیا ہے جن میں سلطان قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، اس کے ورثا، ناصر الدین محمود، بلبن اور کیقباد شامل ہیں۔ یہ عہد تاریخ ہند میں خاندانِ غلامان کے نام سے مشہور ہے لیکن زیر نظر کتاب کے مورخین نے اسے مملوک خاندان سے موسوم کیا ہے۔ کیونکہ اس اصطلاح میں ایک ایسے غلام کے معنی پنہاں ہیں جو آزاد والدین سے پیدا ہوا ہو۔

چوتھا باب تھا جلال الدین خلجی اور علاؤ الدین خلجی سے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے جس میں محکمہ مالگزاری میں اصلاحات، معاشی ضوابط کی تفصیلات درج ہیں اور آخری منگول حملے کا ذکر ہے۔

پانچویں باب میں غیاث الدین تغلق محمد بن تغلق، فیروز تغلق اور اس کے جانشینوں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں جو بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

چھٹا باب سید خاندان سے متعلق ہے جبکہ ساتواں اور آخری باب لودھی خاندان کا احاطہ کرتا ہے جس میں بہلول لودھی، سکندر لودھی اور آخری لودھی سلطان ابراہیم شامل ہیں۔ ابراہیم لودھی کی حکومت 1517 سے 1526 تک قائم رہی اور 1526 میں بابر سے شکست کے بعد ہندوستان پر مغلیہ سلطنت قائم ہوگئی۔

یہ کتاب ان محققین کے باہمی تعاون کا نتیجہ ہے جنھوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کی تاریخ کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا اور ادبیات، کتابیات، سکہ جات اور دیگر دستیاب شہادتوں کی بنیاد پر اپنی رائیں قائم کیں۔

غرض یہ کہ موجودہ جلد کو ایک مستند دستاویز کہا جاسکتا ہے جس میں صرف عہد سلطنت ہی کا احاطہ 1000 صفحات میں پھیلا ہوا ہے اور جو نہ صرف طلبہ بلکہ بڑے پڑھنے والوں کے لیے بھی کارآمد ہے۔

● اتحاد سے انتشار کی طرف (کلونیل اودھ کے قصبات)

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

صفحات: 415، قیمت: 244 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: جاوید رحمانی، 401/2AB، بدھ وہار، نئی دہلی-110067

پرانے زمانے میں تاریخ، شاہی فتوحات تک محدود ہوتی تھی۔ کچھ ترقی کی تو شاہی معاملات تک پہنچی۔ شاہی محلات سے باہر ایک مورخ کی دلچسپی کی کوئی چیز نہ ہوتی تھی۔ اس کے بعد ہمارے نظریۂ تاریخ میں انقلابی تبدیلی آئی اور تاریخ کے مرکز میں شاہی خاندان نہ رہے بلکہ عوامی زندگی آگئی اور سماجی، معاشی اور معاشرتی غرض کہ کئی قسم کی تاریخیں لکھی جانے لگیں تاکہ زندگی کی

پیچیدگی کا پوری طرح احاطہ کیا جاسکے۔ زندگی جیسی پیچیدہ اور عجیب و غریب شے کا پوری طرح احاطہ تو بہر حال ممکن نہ تھا لیکن اس کوشش میں اتنا ضرور ہوا کہ تاریخ کے کئی دبستان/ اسکول بن گئے اور ہمارے مورخوں نے طرح طرح کے تجربے کیے۔ انھی میں ایک معروف تجربہ یہ بھی تھا کہ کسی ملک کے اہم شہروں/مراکز کو بنیاد بنا کر تاریخیں لکھی گئیں اور ہندوستان کے بھی اہم شہروں مثلاً دہلی، لکھنؤ، آگرہ اور پٹنہ وغیرہ کو مرکز میں رکھ کر کئی اہم تاریخیں لکھی گئیں۔ یہ طریقہ اچھا تو تھا لیکن ہندوستان جیسے ملک سے پوری طرح انصاف نہیں کرسکتا تھا جس کی آبادی کا بڑا حصہ دیہات اور قصبات میں رہتا ہے۔ اسی خیال کے پیش نظر مشیر الحسن نے قصباتی تشخص اور قصبات کے ہند ایرانی تہذیبی ورثے کی چھان پھٹک کو ضروری خیال کیا۔ اس کی تہہ میں یہ خیال بھی کارفرما تھا:

''دارالسلطنت یا ایسے بڑے بڑے مقامات کی زندگی بہترین قسم کے لوگوں کو پیدا کرنے کے مناسب نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ دولت کے عیوب نسل اور تربیت دونوں کے دشمن تھے... دیہات میں لوگ اپنی کھیتی باڑی کے مشاغل میں پھنسے رہتے تھے، وہاں کی آب و ہوا بھی علمی ترقی اور دماغی ارتقا کے خلاف پڑتی تھی۔ اسی وجہ سے زمانے نے قصبات کو پیدا کردیا تھا...... یہاں کی سرزمین عمدہ لوگوں کو پیدا کرنے کے مناسب تھی...... ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے، شہر کا ہر بڑا خاندان کسی نہ کسی قصبے کے سلسلے پر فخر کرتا ہے۔'' (محمد علی ردولوی)

محمد علی ردولوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''شہروں میں یہیں کے لوگ جا کر بادشاہ کو بادشاہی اور وزیروں کو وزارت سکھاتے تھے۔'' اودھ کے قصبات سے پورے ہندوستان میں پھیلنے والے ایسے ہی ایک خاندان کا انتخاب پروفیسر مشیر الحسن نے کیا ہے۔ یہ قدوائی خاندان ہے جس کی ''مختصر، سریع اور مضطرب اتار چڑھاؤ کی تاریخ کی بازدید کے لیے... دھند اور گرد و غبار کو ہٹانے کی کوشش'' مشیر الحسن نے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ لوگ ایک چھوٹے سے گاؤں مسولی اور اس کے آس پاس کے ریاستہائے متحدہ (یوپی) سے بارہ بنکی ضلع کے دوسرے علاقوں خصوصاً گدیہ (ان لوگوں نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں رسولی سے ترک وطن کیا تھا)، بڑا گاؤں، بھیارہ، رسولی، جگور، فیض آباد، اناؤ، رائے بریلی اور ہردوئی میں بسے ہوئے تھے۔ اپنے آپ کو باہر کی دنیا سے الگ تھلگ رکھنے کے بجائے ان لوگوں نے ضلع سیتاپور، محمود آباد، بلہرا، بھٹوامئو، جہانگیر آباد، گوپامئو اور مہوا کے شیوخ سے رشتے استوار کیے، بجنور اور بانسہ (بڑا گاؤں سے گونڈہ جانے والی سڑک کے چوراہے سے ڈھائی میل اور لکھنؤ سے تقریباً اٹھائیس میل) کے سیدوں سے ازدواجی رشتے قائم کیے۔ مغل حکومت کے ملازمین میں ایک معتد بہ تعداد کا تعلق انھی ہی قصبات سے تھا۔ پھر بھی خاندانی وقائع نویس کا خیال ہے کہ قدوائی قبیلے کے بے شمار خاندان طاق نسیاں کی زینت بن گئے اور بے شمار وہ لوگ قدوائی بن گئے جو قدوائی نہیں تھے۔''

انھیں یہ احساس بھی ہے کہ جنوبی ایشیا میں ایسے مطالعوں کی گنتی اہم تاریخی تحریروں میں نہیں ہوتی، اس کے باوجود وہ یہ مطالعہ قدوائیوں کی زندگی کی اس تکثیریت (Pluralism) پر روشنی ڈالنے کے لیے کرتے ہیں جو ان لوگوں کی نجی اور عوامی زندگی کی خصوصیت رہی ہے، وہ مختلف لغات کی مدد سے قصبہ کی تعریف متعین کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے سفر پر نکلتے ہیں۔ اس وضاحت کے ساتھ کہ اس زمانے کے قصبات اس زمانے کی سرکاری یا انگریزی تاریخوں میں اگرچہ لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے اڈے کی حیثیت رکھتے تھے لیکن حقیقتاً وہ ''قصبات انیسویں اور اوائل بیسویں صدی میں ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں کے اصل میدان تھے۔ یہی قصبات تھے جہاں صحیح معنوں میں زندگی گزاری جاتی تھی، یہ قصبات ہی تھے جہاں شعر و شاعری، ادب اور موسیقی نے نمو پائی اور یہی قصبات تھے جہاں تہذیبوں اور ثقافتوں کے امتزاج باہم کے مواقع فراہم ہوئے۔''

دوسرے باب ''اب وہ دریا نہ وہ بستی نہ وہ لوگ'' کا آغاز'' کار جہاں دراز ہے'' کے ایک طویل اقتباس سے ہوتا ہے جس کا مقصد مصنف کے بقول یہ ہے کہ ''یہ سطریں، اس باب میں زیر بحث عہد کے موڈ اور اس کی فضا کو سرکاری بیانات اور سرکاری تذکروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ موثر طور پر پیش کرتی ہیں۔''

اس باب میں ولایت علی قدوائی کی سرگرمیوں کا احاطہ مختلف حوالوں سے کیا گیا ہے۔ تیسرا باب ''داستان ایک خاندان کی'' ہے۔ اس باب میں پہلے تو پروفیسر مشیر الحسن نے ولایت علی بمبوق/ قدوائی کے خاندانی پس منظر پر روشنی ڈالی ہے اس کے بعد'' ولایت علی اور قصبے کے بہت سے دوسرے افراد کے خیالات و نظریات کے تاریخی اور ثقافتی حوالے قائم کرنے اور انگریزوں کی پالیسیوں سے پیدا ہونے والے نئے حالات سے اپنے آپ کو مطابقت دینے کے طریقوں اور راستوں کی ان کی تلاش و جستجو کی تفتیش کی ہے۔''

چوتھے باب کی سرخی ''مملکت خداداد میں'' ہے جو اس لحاظ سے خاصی مغالطہ آمیز ہے کہ اس سے ذہن فوراً پاکستان کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جبکہ اس باب کا تعلق کسی طرح پاکستان سے نہیں، بلکہ اس میں قصبات کے حوالے سے

قدوائیوں کی مذہبی، روحانی اور ثقافتی زندگی کی مختلف سطحوں اور حصوں کے درمیان موجود خارجی تسلسل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچواں باب "آداب اور سیاسی اخلاقیات" ہے جس میں حکیم اجمل خاں ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور رفیع احمد قدوائی کی سیاسی خدمات اور اخلاقیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حکیم اجمل خاں کے بارے میں جو حکیم احسن اللہ خاں کے خاندان سے تھے، مشیرالحسن لکھتے ہیں:

"حکیم صاحب کی عوامی زندگی میں جس چیز کی واضح عکاسی ملتی ہے وہ غیر مؤثر اور جاں بلب تکثیریت (Pluralism) نہیں بلکہ ایک جاندار، فعال اور توانا مشترک تہذیب ہے۔"

مشیرالحسن صاحب بتاتے ہیں کہ "اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور گاندھی جی کے زیر تربیت رہنے والے شفیق الرحمٰن قدوائی بھی شہرت اور نام ونمود سے ہمیشہ دور بھاگے۔ وہ نادرونایاب انسانوں میں سے تھے۔"

اور ڈاکٹر انصاری کے بارے میں توترکی ادیبہ خالدہ ادیب خانم کے تاثرات سے اردو دنیا واقف ہی ہے۔ اس کے باوجود مشیر صاحب نے اس باب میں ان کی صورت گری بڑی توجہ اور انہماک سے کی ہے اور رفیع احمد قدوائی کا تو ذکر اس قدر والہانہ انداز میں کیا ہے کہ ان کے دیکھنے کی آرزو مچل اٹھتی ہے۔ انھوں نے صحیح لکھا ہے کہ "رفیع صاحب کے خیالات اور زندگی کے انداز کی ہیئت ہمیشہ وہی رہی جو ان کی جوانی میں ان کے چچا [ولایت علی قدوائی] نے تشکیل دی تھی۔"

رفیع احمد قدوائی کی زندگی کا ایک بڑا اور اہم کام "آزادی کی نظمیں" مرتبہ سبط حسن کا مقدمہ تھا۔ یہ کتاب اشاعت کے فوراً بعد ضبط کرلی گئی تھی۔ اس کا ذکر البتہ مشیرالحسن صاحب سے رہ گیا ہے۔ چھٹے باب پر "لکھنؤ ہم پر فدا ہے ہم فدائے لکھنؤ" کی سرخی قائم کی گئی ہے اور اس زمانے کے لکھنؤ پر روشنی ڈالی گئی ہے روڈیارکپلنگ کے اس بیان سے یہ باب شروع ہوتا ہے کہ "عروس البلاد بمبئی کے علاوہ اپنی چمک دمک اور بھڑکیلے انداز کے اعتبار سے لکھنؤ جیسا کوئی دوسرا شہر نہیں ہوگا۔"

اس شہر کا تذکرہ اس کتاب کے فریم ورک میں ایک تو اس لیے شامل ہوا کہ "عہدے اور حیثیت کا کلونیل خبط اور طبقاتی امتیاز کو قائم رکھنے کی خواہش اگرچہ باہم گندھی ہوئی تھی مگر شادی بیاہ کے موقع پر ہونے والی دعوتیں ایسے مواقع فراہم کردیتی تھیں جو برطانوی طبقۂ اعلیٰ اور 'نیٹیوز' کے درمیان تفریق و امتیاز کی خلیج کو کسی قدر کم کردیتے تھے۔"

دوسرے اس لیے کہ 'یہی وہ شہر ہے جہاں ولایت علی کے بچے بڑے ہوئے، یہی وہ جگہ ہے جہاں انھوں نے تعلیم حاصل کی، ہاکی اور کرکٹ کھیلے، عوامی بحثوں میں حصہ لیا اور بالآخر اپنی اپنی زندگیوں کی راہیں طے کیں۔' ساتویں باب کا عنوان ہے "تقسیم کے سائے میں"۔ اس کا آغاز ماؤنٹ بیٹن کے ایک اقتباس سے ہوتا ہے جس میں تقسیم کے سلسلے میں ماؤنٹ بیٹن اور پنت کی گفتگو ہے۔ اس باب میں تقسیم کے سائے میں سانس لیتے اودھ، قدوائی خاندان اور اردو زبان کی صورت حال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حالانکہ مصنف نے بڑی سادہ دلی سے یہ اعتراف کیا ہے کہ قدوائی خاندان کو تقسیم کا اس قدر نقصان نہیں اٹھانا پڑا جتنا بارہ بنکی اور قرب و جوار کے دوسرے مسلمان خاندانوں کو، لیکن ایسا کیوں ہوا؟ اس بارے میں مشیر صاحب کا تجزیہ نامکمل اور ادھورا ہے۔ یہ اس پیچیدہ صورت حال کا احاطہ نہیں کرپاتا جس سے قدوائیوں کو دوچار ہونے کے بعد یہ سرخروئی حاصل ہوئی۔

آٹھواں باب بعنوان "گردش دوراں: نیرنگیاں مقدر کی" لکھا گیا ہے جو بیحد مختصر ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں" اس سے قدوائی خاندان بھی مستثنیٰ نہیں۔ یہ کتاب قدوائی خاندان کو مرکز میں رکھ کے ایک ایسے عہد کے مسلم اشراف کی نفسیات اخلاقیات اور سماجی/ سیاسی خدمات کا احاطہ کرتی ہے جو برصغیر کی تاریخ کا سب سے نازک پیچیدہ اور ہر لمحہ تبدیل ہوتا ہوا عہد ہے۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مشیرالحسن صرف مورخ نہیں ہیں بلکہ ادب کے پرشوق طالب علم بھی ہیں اس لیے اس پوری کتاب میں ادب پاروں سے جس طرح کام لیا گیا ہے اس کی مثال بہت کم تاریخی کتابوں میں ملے گی اس اجتہادی انداز نے ایک طرف اس داستان کو بے کیف ہونے سے بچایا تو دوسری طرف مشیرالحسن کو ان سچائیوں تک بھی پہنچایا جن تک بالعموم تاریخ اور مورخ کی رسائی نہیں ہوتی اور وہ سچائیاں ادب پاروں میں دفن ہوتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مشیرالحسن صاحب کی اس کتاب کا اردو دنیا میں پرجوش خیر مقدم کیا جائے گا۔

● افادات

مصنف: خورشید لکھنوی

صفحات: 106، قیمت: 62 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔66

مبصر: عبدالرب، 265، سابرمتی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی-110067

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی ایسی کتابوں کی اشاعت کو شروع سے اہمیت دی ہے جو طلبہ کے ذہن و ذوق کی آبیاری

کرسکتی ہیں، اس سلسلے میں اردو کی کئی قدیم کتابیں دوبارہ منظرعام پر آئی ہیں جو علمی و ادبی اہمیت کی حامل ہیں لیکن اب دستیاب نہیں۔ انھی میں خورشید لکھنوی کی ''افادات'' بھی ہے۔ خورشید لکھنوی شاعر بھی تھے اور علم عروض پر اچھی نگاہ رکھتے تھے۔ اب تو بیشتر شعرا علم عروض و قافیہ کو اہمیت نہیں دیتے اور اپنی شاعری کو صرف موزونیِ طبع کا کرشمہ سمجھتے ہیں لیکن اب سے نصف صدی پیشتر اساتذہ سے ان علوم کی باقاعدہ تحصیل کی جاتی تھی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کم و بیش ایک ہی زمانے میں یگانہ چنگیزی، مرزا اوج اور حسرت موہانی وغیرہ موجود ہیں جو نہ صرف یہ کہ اپنے زمانے کے بہت اچھے شاعر ہیں بلکہ علم عروض میں بھی مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ ان دنوں اردو میں ان علوم پر کتابوں کی تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا اور کئی اہم کتابیں اس سلسلے میں لکھی گئیں، اسی سلسلے کی ایک کتاب ''افادات'' بھی ہے۔ اس کتاب کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے خورشید لکھنوی لکھتے ہیں:

''ایک صاحب میرے دوستوں میں ہیں انھوں نے ایک تاریخ فارسی کہی اور مجھے سنائی میں نے بہت تعریف کی دو مصرعوں میں البتہ میرے نزدیک نقص تھا۔ ایک میں لقمان باعلان نظم ہوا تھا اور دوسرے میں شاید معصومین باعلان نظم ہوا تھا، میں نے کہا یہ خلاف فصاحت ہے باعلان نظم کرنا ان کا نہ چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ یہ امر تو اس قدر مشہور ہے کہ مبتدی بھی جانتے ہیں۔ میں نے سہواً اس طرح نظم نہیں کیا۔ بلکہ مجھے بھی وقت نظم یہ خیال آیا تھا کہ بعض الفاظ ایسے ہیں کہ ان کا تلفظ باخفا بہت ہی برا معلوم ہوتا ہے۔ اسی سے میں نے باخفا نظم نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ ہاں ہماری زبان میں تو واقعی بعض الفاظ باخفا بہت ہی برے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر فارسی میں ایسا نہیں ہے انھوں نے کہا کہ میں زبان فارسی سے بالکل نابلد ہوں میں نے اپنی ہی زبان پر قیاس کیا شاید فارسی میں بھی ایسا ہی ہو۔''

اس کے بعد خورشید لکھنوی کے بقول انھوں نے دو بڑے اردو و فارسی داں حضرات سے رجوع کیا لیکن وہ اس کی گرفت نہ کرسکے اور جب خورشید لکھنوی نے توجہ دلائی تو انھیں خیال آیا کہ اعتراض درست ہے گویا کہ اس کتاب کی تالیف کا سبب بھی دراصل علم عروض سے لوگوں کی روز بہ روز کم ہوتی ہوئی واقفیت ہی تھا۔

اس کتاب میں مصنف نے اردو کی تمام مروجہ بحروں اور زحافات کا مطالعہ پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں اردو کے تمام اساتذہ کے یہاں سے مثالیں بھی دی ہیں۔ بعض مقامات پر زیادہ وضاحت کی خاطر جدول بنا کر شعر کی تقطیع کی ہے۔ فارسی اور اردو کے اساتذہ کے یہاں جن الفاظ کا اخفا ممنوع رہا ہے ان کی بھی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ اس طرح یہ کتاب ان اصحاب کے لیے جو شعرگوئی یا شعر کی تنقید میں دلچسپی رکھتے ہیں بہت کام آنے والی کتاب ہے۔ کسی قدر پریشانی البتہ اس سے ہوتی ہے کہ مؤلف کی زبان کسی قدر نامانوس معلوم ہوتی ہے کہ اس پر قدیم فارسی نثر کا اثر گہرا ہے۔ خورشید لکھنوی کو اپنے پیشرووں سے شکایت ہے کہ انھوں نے علم عروض و قافیہ پر جو رسالے لکھے ہیں ان کا سمجھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں اور اسی لیے انھوں نے اپنے طور پر یہ کوشش کی ہے کہ اس کتاب کے تمام تر مندرجات ہر اس شخص کی سمجھ میں بھی آجائیں جو علم عروض سے قطعی نابلد ہو۔

اس کتاب میں خورشید لکھنوی علم عروض کی بحث شروع کرنے سے پہلے متروکات پر روشنی ڈالتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ''مخفی نہ رہے کہ متروکات کی دو قسمیں ہیں ایک وہ کہ جن کا ترک میرے نزدیک ضروری ہے اور دوسرے وہ کہ جن کا ترک ضروری نہیں ہاں بہتر ہے ترک ان کا لاً ایک شرط کے ساتھ اور وہ شرط یہ ہے کہ زبان بگڑ نہ جائے یعنی اگر ان کے ترک کے سبب سے زبان بگڑ جائے اور وہ مزہ کلام میں نہ رہے جو بغیر ترک رہتا ہے تو انھیں ترک نہ کرے۔''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خورشید لکھنوی کے نزدیک بھی آخری حَکَم ذوق سلیم ہی ہے البتہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ علم عروض و قافیہ کے تمام آداب سے واقفیت بھی ہو اور اس مقصد کے لیے یہ کتاب امید ہے کہ کارآمد ثابت ہوگی۔

● غالب اور ہماری تحریک آزادی

مصنف: شمیم طارق

صفحات: 224، قیمت: 500روپے

ناشر: شمیم طارق، فلیٹ نمبر 27، چوتھی منزل، مرزبان مینشن، بائیکلہ فروٹ مارکیٹ، بائیکلہ، ممبئی-400027

مبصر: محمد کاظم، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی-110007

''غالب ان لوگوں میں تھے جنھیں ہندوستان کے تباہ ہونے یا غلام ہونے کا نہیں بلکہ اپنی پنشن و خلعت سے محروم ہونے کا غم کھائے جارہا تھا۔ وہ پوری طرح انگریزوں کے طرفدار تھے۔'' (صفحہ-179)

''غالب انگریزوں کی خوشامد کی اپنی پرانی وضع پر آخری سانس تک قائم رہے۔'' (صفحہ-41)

''غالب بھی اپنے زمانے کی جاگیردارانہ رجعت پسند سماج کے اس طبقے کی آواز تھے جو نہ صرف اپنے لیے جیتا ہے بلکہ اپنے مفاد کے لیے قومی غیرت و مفاد کو بھی قربان کردیتا ہے۔'' (صفحہ-164)

''اس عہد کے حالات اور غالب کے کردار کے سامنے ان میں سے کوئی

استدلال بھی پائیدار نہیں ثابت ہوتا کیونکہ مصلحت و مجبوری اور کمزوری کس کے ساتھ نہیں ہے؟ اگر تمام لوگ غالب کا طرز عمل اختیار کرلیں تو دنیا میں ظلم کے خلاف مزاحمت کے تمام سلسلے ختم اور انقلاب کے تمام سوتے خشک ہوجائیں۔"
(صفحہ-28)

یہ جملے شمیم طارق نے زیر تبصرہ کتاب "غالب اور ہماری تحریک آزادی" میں تحریر کیے ہیں اور ایسی بہت سی باتیں کہی ہیں جن کی جانب ہماری توجہ یا تو ہوئی نہیں اگر ہوئی تھی تو ان کے اظہار سے اغماز کیا گیا۔

شمیم طارق موجودہ دور کے ایک اچھے صحافی، محقق، نقاد اور ایک حساس شاعر ہیں اور ہندوستانی سماج، سیاست، تہذیب اور ثقافت پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

غالب پر اتنا لکھا گیا ہے کہ اب ان پر قلم اٹھانے سے پہلے بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے، ان پر لاتعداد مضامین اور بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن شمیم طارق نے ایک نیا پہلو نکالا ہے۔ کالی داس گپتا رضا نے شمیم طارق کے سلیقے کی داد دیتے ہوئے کہا ہے:

" مجھے خوشی ہے کہ جناب شمیم طارق کو تحقیق کے آداب کے ساتھ اختلاف رائے کا سلیقہ بھی آتا ہے۔ انھوں نے اپنے موقف کی تائید میں جو دلائل دیے ہیں وہ میری تشفی کے لیے کافی ہیں۔"

زیر تبصرہ کتاب سات عنوانات کے تحت لکھے گئے مقالات پر مشتمل ہے جس میں غالب اور عہد غالب، غالب اور ہماری تحریک آزادی، غالب اور سرسید احمد خاں، ایسے مضامین ہیں جن میں عہد غالب کے سماجی، سیاسی، اقتصادی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اہم مذہبی، سماجی اور سیاسی تحریکات کے اثرات بھی واضح کیے گئے ہیں۔ غالب کے مقاصد اور سرسید احمد خاں کے مقاصد کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غالب اور سرسید دونوں کے تعلقات انگریزوں سے تھے لیکن غالب کے تعلقات ذاتی اغراض پر مبنی تھے تو سرسید کو پوری قوم کا مفاد عزیز تھا اور اسی کے پیش نظر وہ انگریزوں سے تعلقات بہتر بنائے ہوئے تھے۔

آخر کے چار ابواب دستنبو پر ایک نظر، غالب کی قصیدہ گوئی، ایک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے اور "1857 سے متعلق غالب کے خطوط" کے عنوان سے شامل کتاب ہے۔ دستنبو سے ہم سب واقف ہیں کہ غالب کے پیش نظر کیا تھا۔ شمیم طارق نے اسے مزید روشن کردیا ہے اور حوالے خود غالب کے بیانات سے دیے ہیں۔ اس لیے انکار یا اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ شمیم طارق نے ایک نکتہ یہ اٹھایا ہے کہ 1857 کے واقعات غالب کے شعری تجربے میں نہیں ڈھل سکے ہیں۔ آخر میں 1857 سے متعلق غالب کے خطوط کا انتخاب تاریخی ترتیب سے شامل کتاب ہے۔

دو اہم باب توقیت غالب (1857 سے وفات تک) اور 1857 کے بعد غالب کی مطبوعات ہیں۔ ساتھ ہی ضمیمہ کے تحت مولانا فضل حق خیرآبادی قصیدۂ "ہمزیہ" اور قصیدۂ "دالیہ" کے تراجم شامل ہیں جن سے کتاب کی قدروقیمت اور بڑھ گئی ہے، یعنی شمیم طارق کے خیالات کو اور بھی پختہ حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

یہ کتاب پہلی بار فروری 2002 میں شائع ہوئی تھی جس کی تمام کاپیاں اسی سال ختم ہوگئیں اس کی بڑھتی ہوئی مانگ کے پیش نظر انھیں خود دوبارہ شائع کرنا پڑا۔ یہ کتاب شمیم طارق کی برسوں کی محنت اور تحقیق کا ثمرہ ہے جس کا اثبات اس کی مقبولیت سے ہوتا ہے۔

● **"اقبال کے اردو کلام کی مبسوط فرہنگ" (جلد اول)**

مؤلف: ڈاکٹر سید صادق علی

صفحات: 352، قیمت: 200 روپے

ناشر: سید صادق علی، انجمن کتاب گھر، نال والی مسجد، امیر گنج، ٹونک

مبصر: ارشد عبدالحمید، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، ٹونک-304001

اقبال ہمارے ان شعرا میں سے ہیں جن پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے مطالعۂ اقبال کے ہر پہلو اور ہر گوشے کا احاطہ کرلیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس موضوع پر کوئی نئی کتاب شائع ہوتی ہے تو "توسن ادراک انساں" تجسس کی راہ پر اڑنے لگتا ہے کہ دیکھیں اس کتاب میں تازگی کا کون سا عنصر اور افادیت کا کون سا زاویہ روشن ہوا ہے۔ خود علامہ کے الفاظ میں:

یہ تلاش متصل شمع جہاں افروز ہے

زیر تبصرہ کتاب مطالعۂ اقبال کی ایک بنیادی اور بڑی ضرورت کو بہ طرز احسن پورا کرتی ہے۔ فرہنگ میں شامل مقدمے میں ایسے بہت سے موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں جو اقبال کے کلام کو خوبی کے ساتھ سمجھنے کی کلید کہے جاسکتے ہیں۔ مقدمے بلکہ پوری کتاب سے واضح ہے کہ صاحب کتاب کے ذہن میں اقبال شناسی اور اقبال فہمی کے تمام نقوش پوری طرح صاف ہیں۔

مقدمے میں اقبال کے لسانی پس منظر، ادبی مقصد، فکری جہات، شعری منصب استعاراتی نظام، علامتی فضا، تشبیہات، پیکر تراشی، تراکیب سازی، تلمیحات، عربی اور فارسی کے اثرات، اسالیب بیان، یہاں تک کہ مروجہ لسانی رویے کی خلاف ورزی تک، ہر پہلو پر گفتگو کی گئی ہے۔ پچپن صفحات کے اس مقدمے کو شعریات اقبال کا نہایت کارآمد خلاصہ کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں۔ اس خلاصے میں مروجہ نظریاتی مباحث کی شمولیت کے ساتھ تلاش و اختراع سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس کی دو مثالیں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے:

(1) ماورائی/مابعد الطبیعیاتی اسلوب۔ مقدمہ نگار نے کلام اقبال میں

ماورائی اور مابعد الطبیعیاتی موضوعات و مسائل کی مرکزیت اور اسلوب بیان کی انفرادیت کے باعث اسے اقبال کا ایک مستقل اسلوب تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے اس اسلوب کی دریافت پر مدلل توجہ دی ہے اور اس طرح مطالعۂ اقبال کی اسلوبیاتی جہت میں ایک نئی جہت کا اضافہ کر دیا ہے۔

(2) ڈاکٹر صادق نے علامہ سے عقیدت کے باوجود ان کمیوں کو نظر انداز نہیں کیا ہے جو زبان و ادب کے اعلیٰ مذاق پر گراں گزرتی ہیں۔ ''کلام اقبال میں محاورے اور روزمرّہ کی خلاف ورزیاں'' عنوان سے انھوں نے ایسی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ مثلاً:

تاروں کی فضا ہے بے کرانہ
تو بھی یہ مقام آرزو کر

شعر پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صادق لکھتے ہیں: ''اس شعر میں ''تو بھی اس مقام کی آرزو کر'' کی جگہ ''تو بھی یہ مقام آرزو کر'' استعمال کیا ہے۔''

لیکن اس طرح کی غلطیوں کی نشاندہی کے بعد وہ سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں یہ کہنا نہیں بھولتے کہ ''ان کی ایک لغزش مستانہ پر ہزاروں سنجیدہ اور متین رفتاریں قربان''۔ ظاہر ہے کہ اپنے عظیم شاعروں کے ساتھ ہمارا یہی رویہ ہونا چاہیے۔

مقدمے کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اصل کتاب تو دراصل وہ فرہنگ ہے جو ''آ'' اور ''الف'' سے لے کر ''خ'' تک کے حروف سے شروع ہونے والے الفاظ، تراکیب، محاوروں اور فقروں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے صفحہ 7 اور صفحہ 8 پر درج تفاصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ''خ'' سے ''ف'' کے حروف پر مشتمل لفظیات دوسری جلد میں اور ''ق'' سے ''ی'' تک کے حروف والے الفاظ فرہنگ تیسری جلد میں پیش کی جائے گی۔

جلد اوّل کے مشمولات سے فرہنگ کے طریقۂ کار، انتخاب الفاظ، معنی کے اندراج اور مثالوں کے اہتمام کا سلیقہ پوری طرح ظاہر ہے۔ اگر قاری کلامِ اقبال کے ساتھ اس فرہنگ کو استعمال میں لائے تو اسے اقبال فہمی کے لیے موٹی موٹی تشریحی کتابوں کی ضرورت ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مؤلف نے ایک چھوٹے اور آسان سے لفظ کو بھی اس اعتبار سے اہمیت دی ہے کہ اس کا شعر اقبال میں کیا تخلیقی مقام ہے، پھر مفرد الفاظ سے لے کر تراکیب، محاوروں اور فقروں تک، سبھی کو فرہنگ میں شامل کیا گیا ہے۔ عربی اور فارسی کے فقرے بھی اسی طریقۂ کار کا حصہ ہیں بلکہ تیسری جلد میں عربی فارسی فقروں کا اشاریہ علاحدہ سے بھی شامل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ تمام باتیں فرہنگ کی افادیت پر دال ہیں۔

معنی کے اندراج میں دو باتیں خصوصاً مفید ثابت ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ متعلقہ لفظ کے تمام لغوی معنی درج کیے گئے ہیں۔ اس طرح کلام اقبال میں اس لفظ کی مختلف معنوی سطحوں تک پہنچنے کی تحریک ملتی ہے۔ دوسرے یہ کہ شارحین اور ماہرین نے اس متعلقہ لفظ کے جو مجازی اور تعبیری معنی بیان کیے ہیں۔ ان کا اندراج بھی کر دیا گیا ہے اور مثال میں وہ شعر بھی نقل ہوا ہے جس میں متعلقہ لفظ یا ترکیب استعمال میں لائی گئی ہے۔ یہی نہیں، تمام مستعمل تلمیحات کا تاریخی اور ادبی پس منظر، شخصیات کا تعارف، مقامات کی تاریخ اور اصطلاحات کی وضاحت بھی فرہنگ کا حصہ ہے۔ استعاروں اور علامتوں کی بھی حتی الامکان نشاندہی کی گئی ہے۔ ان خصوصیات نے فرہنگ کو تربیت یافتہ قاری سے لے کر مبتدیوں تک، ہر شخص کے لیے یکساں طور پر مفید اور اہم بنا دیا ہے۔ ضروری ہے کہ اس فرہنگ کی دوسری اور تیسری جلد بھی بہت جلد شائع ہوتا کہ محنت سے تیار کی گئی اس فرہنگ کا پورا فائدہ حاصل ہو سکے۔

کتاب صوری اعتبار سے بھی خوبصورت ہے۔ تین سو باون صفحات کی ہے اس خوبصورت اور کارآمد کتاب کی قیمت دو سو روپے ہے جو اس مہنگائی کے دور میں کم ہی کہی جائے گی۔ قیمت کم رکھنے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون کا دخل ہے۔ پڑھنے والوں کو مؤلف کے ساتھ اس ادارے کا بھی ممنون ہونا چاہیے۔

● **تفہیم و تاثر**

مصنف: ڈاکٹر محمد نعمان خاں
صفحات: 148، قیمت: 200 روپے
ناشر: دبستان بھوپال، مدھیہ پردیش
مبصر: خورشید اختر، 17، ریحانہ کالونی، گلی پری بازار، شاہجہان آباد، بھوپال (ایم. پی.)۔462001

تفہیم و تاثر ڈاکٹر محمد نعمان خاں کی تازہ کتاب ہے جس میں تحقیقی، تنقیدی اور تاثراتی مضامین کے علاوہ ایک رپورتاژ، کیفی اعظمی کے ساتھ ایک صبح اور مجروح سلطان پوری سے ایک انٹرویو بھی شامل کیا گیا ہے۔

کسی اہم ادبی موضوع پر مستقل کتاب کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن مختلف موضوعات پر مضامین کے مجموعے کا فائدہ یہ ہے کہ ایک ہی کتاب میں بہت سے ادبی موضوعات پر تحقیقی اور تنقیدی انداز سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد نعمان خاں نے اردو تحقیق و تنقید کے میدان میں اپنی متانت، سنجیدگی اور دیانت داری سے ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں بھی ایک اچھے ناقد اور محنتی محقق کے سارے گن نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر ''رجب علی بیگ سرور کی مختصر ترین داستان: شرار عشق''، ''ہندی غزل سمت اور رفتار''، ''غالب اور نئی نسل''، ''کیا پریم چند ہندی کے ادیب تھے؟'' ایسے مضامین ہیں جن کے مطالعے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ نعمان صاحب نے تحقیق و تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔

''شرارِ عشق'' کے بارے میں موصوف رقم طراز ہیں'' داستان کے اختصار کا یہ حال ہے کہ قصہ مع سرورق صرف آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ سرورق کو چھوڑ کر ابتدائی ساڑھے تین صفحات تمہیدی ہیں بقیہ ساڑھے تین صفحات میں اصل قصہ اور پند ونصیحت کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ''شرارِ عشق'' تین حصوں میں منقسم ہے۔ سرور نے ان تینوں حصوں میں ایسی مخصوص طرزِ نگارش کا جادو جگایا ہے جس کے سبب ''فسانۂ عجائب'' اور'' گلزارِ سرور'' کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ سرور نے تخیل کو حسنِ تعلیل کا جامہ پہنا کر، اصل قصے کے ساتھ ساتھ اخلاق ونصیحت کی ایسی باتیں بھی بیان کی ہیں جنھیں پڑھ کر نہ صرف مصنف کی دانشوری کا قائل ہونا پڑتا ہے بلکہ جو زندگی کی دشوار راہوں کو آسان اور گوارہ بنا دیتی ہیں۔

پریم چند کے ہندی یا اردو ادیب ہونے کے سوال پر بہت بحث ہو چکی ہے اس معاملے میں ڈاکٹر پریم چند کے ان خطوط کے اقتباسات اپنے مقالے میں شامل کیے ہیں جنھیں پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ پریم چند اردو کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ نرائن نگم کے نام لکھے ایک مکتوب میں پریم چند کہتے ہیں: '' اردو کی ہوا آج کل بگڑی ہوئی ہے۔ اخبار نویسی بہت مشکل ہوگئی ہے۔ جتنے موجودہ رسالے ہیں ان میں کسی کو فروغ نہیں ہے، سب کتے کی زندگی جیتے ہیں۔'' ایک اور خط میں پریم چند لکھتے ہیں: '' اردو میں اب گزر نہیں ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بال مکند گپت مرحوم کی طرح میں بھی ہندی لکھنے میں زندگی صرف کردوں گا۔ اردو نویسی میں کسی ہندو کو فیض ہوا ہے جو مجھے ہو جائے گا۔'' نعمان صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنی کوئی رائے دیے بغیر اس اہم اور وقیع مقالے میں پریم چند کے ہندی یا اردو ادیب ہونے کی بحث کو ایک نئی سمت عطا کی ہے۔

علاوہ ازیں اردو صحافت میں غیر مسلموں کا حصہ، نشاطیہ لب ولہجہ کا شاعر داغ دہلوی، پریم چند کا نمائندہ کردار ہوری، مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی نظریات، اختر الایمان کی نظم گوئی، تخلص بھوپالی کی طنز ومزاح نگاری، رتن سنگھ کی افسانہ نگاری اور دانش گاہوں میں اردو تحقیق کے مسائل ایسے مقالات ہیں جنھیں یقیناً دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ کتاب میں شامل دو تاثراتی مضامین: ایم عرفان مرحوم، اور تاجدار احتشام مرحوم، کے مطالعے سے ہر دو حضرات کی شخصی خوبیاں اور ادبی خدمات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

❑❑❑

مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت

مصنف: وہاب قیصر

'' مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت'' میں ڈاکٹر وہاب قیصر نے مولانا آزاد کی سوانح، تحریریں، صحافت اور وزارت میں جہاں کہیں بھی سائنسی مزاج، سائنسی اصول اور سائنسی برتاؤ نظر آئے انھیں ضبط تحریر کیا ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں موصوف نے مولانا کے لیے سائنس کی تعلیم کا حصول، مولانا آزاد کا سائنسی شعور، غبارِ خاطر سائنس کے تناظر میں، البیرونی اور جعفر الفیۂ عالم اور مولانا آزاد اور ملک میں سائنس کی ترقی جیسے موضوعات سے بحث کی ہے۔

صفحات: 180، قیمت: -/109 روپئے

تاریخ تعلیم ہند

مصنف: سیّد نوراللہ/ جے. پی. نائک، مترجم: مسعود الحق

اس کتاب میں 1765 سے 1947 تک ہندوستان میں عہد بہ عہد ہونے والی تعلیمی تبدیلیوں کا مجمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جدید تعلیمی تاریخ کی ہر اہم منزل پر ایک مکمل اور جامع تبصرہ کرنے، ہر اہم فیصلے کے پیچھے کارفرما اسباب اور ان کے اثرات کو سمجھانے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم کس طرح وجود میں آیا ساتھ ہی یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ تعلیمی اقدام صرف حال ہی کے سمجھنے میں معاون نہ ہو بلکہ مستقبل کی اصلاحات اور تنظیمِ نو کے رخ کی بھی نشان دہی کرے۔

صفحات: 552، قیمت: -/111 روپئے

عبدالسلام صدیقی

آئین ہند کے معمار — بھیم راؤ امبیڈکر

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ میل ملاپ کو بڑھاوا دینے کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کردی تھی۔ رنگ و نسل کے امتیاز کے بغیر انسانی فلاح و بہبود کے لیے وہ ہمیشہ جدو جہد کرتے رہے۔ ان کی پیدائش 14 اپریل 1891 کو ضلع اندور کے ''مہو'' نامی ایک چھوٹے سے گاؤں کے دلت خاندان میں ہوئی۔ یہ لوگ گاؤں کے مکھیا اور زمینداروں کے لیے کام کرتے تھے یہ ان کا خاندانی پیشہ تھا۔

ڈاکٹر امبیڈکر کے دادا مالوجی مہو قصبے کے فوجی اسکول کے صوبے دار تھے۔ ان کا خاندانی نام سنکپال تھا لیکن ان کے والد رام جی نے اپنے کو چھپانے کے لیے گاؤں کے نام کو استعمال کیا۔ یہ وہاں عام رواج تھا کہ جہاں اگر نام کا اختتام ''کر'' پر ہوتا تو وہ اس جگہ کو ظاہر کرتا تھا۔ ان کے گاؤں کا نام امباوادتھا، اس بنا پر ان کا نام امباوادکر ہونا چاہیے تھا۔ امبیڈکر نام کے ایک برہمن ان کے استاد تھے کم سن اور ذہین ''بھیوا'' ان کا پسندیدہ طالب علم ہوگیا۔ انھوں نے اس لڑکے کا نام امبیڈکر رجسٹرڈ کیا۔

گول میز کانفرنس میں جب امبیڈکر ہندوستان کی جانب سے نمائندہ بنا کر بھیجے گئے۔ تو ان کے استاد نے ان کو ایک جذباتی خط لکھا۔ 1972 میں جب ان کی ملاقات اپنے استاد سے دوبارہ ہوئی تو انھوں نے ان کا اکرام بحیثیت استاد کے کیا۔ ابتدا میں امبیڈکر نے تعلیم سے بے اعتنائی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن 1904 میں جب ان کا خاندان ممبئی منتقل ہوا تو ان کے اندر پڑھنے کا جذبہ بیدار ہوا۔ والد نے بھی ان پر پڑھنے کے لیے زور دیا اور اپنی پنشن سے اپنے بیٹے کے لیے ہر اس کتاب کو فراہم کیا جس کی بیٹے نے خواہش کی۔ جب پنشن کی چھوٹی سی رقم ختم ہوجاتی تو وہ اپنی بہن کے زیورات کتابوں کی خریداری کے لیے رہن رکھ دیتے۔ جب اگلی پنشن کے پیسے آجاتے تو رہن رکھے زیورات واپس حاصل کرتے۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے آگے چل کر تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے کیے انھوں نے لندن اسکول آف اکنامکس سے معاشیات میں ایم۔ اے۔ کیا۔ 1916 میں کولمبیا یونیورسٹی سے قانون میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد لندن جانے کا فیصلہ کیا وہ وہاں سے بیرسٹر ایٹ لا کی ڈگری حاصل کرنا چاہتے تھے اسی دوران ان کی بڑودہ اسکالرشپ ختم ہوگئی۔ اسکالرشپ کے مزید دو سال کے اضافے کے لیے انھوں نے درخواست دی جس پر دیوان نے انکار کردیا۔ اس کے بعد انھوں نے مہاراجہ بڑودہ کو درخواست دی اور جواب کا انتظار کیے بغیر لندن چلے گئے۔ لندن پہنچنے کے بعد اضافہ کے ساتھ ایک سال کی اسکالرشپ موصول ہوگئی۔ اور انھوں نے ''گرے ان اسکول آف لندن'' میں بیرسٹر۔ ایٹ لا، ایم۔ ایس۔ سی، پی۔ ایچ۔ ڈی ڈگری کے لیے داخلہ لیا۔

امبیڈکر نے ایک سال کے کم عرصے میں اپنے تجویز شدہ مقالے کا خاکہ تیار کیا۔ جس کا عنوان "The Provincial

"decentralization of Indian finance" تھا۔ لیکن اسکالرشپ میں مزید توسیع نہ ہوسکنے پر مجبوراً ہندوستان واپس آگئے اور ان کی حوصلہ مندانہ تعلیم تنگ دستی کی نذر ہوگئی۔ بیرون ملک میں قیام کے دوران ان کی دو کتابیں منظر عام پر آئیں۔ ان میں ایک مقالہ 1960 میں کولمبیا یونیورسٹی کے سیمینار کے لیے لکھا گیا تھا جس کا عنوان Castes in India: Their Machanism, Genesis and Development تھا۔ جسے Journal of Indian Anti Quality نامی اخبار نے شائع کیا۔ دوسرا مقالہ معاشیات میں پی۔ایچ۔ڈی کے لیے لکھا۔ جس کا عنوان تھا۔ "The Evolution of Provincial Finance in British India". یہ مقالہ 1972 میں شائع ہوا۔ انھوں نے 1972 میں استحصال زدہ اور انسانی حقوق سے محروم سماج کی فلاح و بہبود کے لیے آواز اٹھائی بعض با اثر حلقوں نے نہ صرف ان کی مخالفت کی بلکہ ان کو ذلیل کرنے کی کوشش بھی کی، لیکن ڈاکٹر امبیڈکر نے ہندوستانی سماج سے معاشرتی برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا بیڑا اٹھالیا تھا۔ انھوں نے اپنے قول وعمل سے یہ ثابت کردیا کہ برتری کسی مخصوص ذات میں پیدا ہونے پر منحصر نہیں اور نہ ہی اس پر کسی مخصوص مذہب کی اجارہ داری ہوسکتی ہے۔

ہندوستانی آئین کو تیار کرنے والی ڈرافٹنگ کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے انھوں نے 29 اگست 1947 سے لے کر 25 نومبر 1949 تک جس محنت اور لگن سے آئین کا مسودہ تیار کیا وہ ان کا ایک عدیم المثال کارنامہ ہے۔ امبیڈکر مہاتما گوتم بدھ، سنت کبیر داس، جیوتی با پھلے کے نظریات سے متاثر تھے اسی وجہ سے وہ ایسے سماج کی تعمیر کرنا چاہتے تھے جس میں مساوات، آزادی اور بھائی چارے کی حکمرانی ہو۔ وہ پامال اور پسماندہ طبقوں کا حوصلہ برابر بڑھانے کی کوشش کرتے رہے۔

امبیڈکر نے ہمیشہ ناانصافی، ظلم وستم اور استحصال کے خلاف جدوجہد کی۔ وہ ہر مسئلے کا حل قانون کی روشنی میں تلاش کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو پورے ملک میں طوائف الملوکی پھیل جائے گی۔ ان کا ماننا تھا کہ برطانیہ میں اگرچہ غیر تحریر شدہ آئین وہاں کی روایات کی موجودگی کی وجہ سے کسی بدنظمی کا باعث نہیں بنا لیکن ہندوستان میں یہ روایات موجود نہیں اس لیے یہاں تحریری آئین ہونا ضروری ہے۔ اس بنا پر ڈاکٹر امبیڈکر نے پارلیمنٹ کی جگہ آئین کی بالادستی کا اصول اختیار کیا اور عدلیہ کو قانون سازی کی تشریح وتعبیر کا حق دے دیا۔

ہندوستان کے آئین میں عاملہ Administration عدلیہ Judiciary اور قانون سازیہ Lagislative اداروں کے درمیان اندرونی تناسب قائم کرکے آئین کے بنیادی ڈھانچے اور راہبر اصولوں کو ترمیم وتنسیخ سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ جس پر اب بھی عمل ہو رہا ہے۔ امبیڈکر نے آزاد ہندوستان کو بنیادی حقوق اور ضمیر کی آزادی کے ان تصورات کا تحفہ عطا کیا جن پر آج ملک کی جمہوریت کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ اس عمارت کے حقیقی معمار ڈاکٹر امبیڈکر ہی تھے کیونکہ مسودہ کمیٹی نے ہندوستانی آئین کا جو مسودہ تیار کیا تھا اس کا ایک ایک لفظ ان کے ذہن اور قلم سے نکلا تھا۔ انھوں نے گاؤں کی جگہ فرد کو بنیادی اکائی قرار دینے پر زور دیا اور اس مقصد میں کامیاب ہوئے۔

موجودہ دور میں پوری دنیا میں فرد کی اہمیت کو تسلیم کیا جا چکا ہے ڈاکٹر امبیڈکر نے 1950 ہی میں ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کو وہ سب کچھ دے دیا تھا جو 21 دیں صدی کے آغاز میں دنیا کے عوام حاصل کر رہے ہیں۔ وہ شخصی آزادی کے زبردست حامی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سماج میں رہنے سے انسان کی شخصیت معدوم نہیں ہوسکتی۔ اس کی ایک آزادانہ زندگی ہے اور آزادانہ وجود جو اس کی شخصی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ قومیں شخصی آزادی کو سلب نہیں کرتی ہیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے آزادی اور اخوت پر ہمیشہ زور دیا۔ انھوں نے درج فہرست اقوام وقبائل اور پسماندہ ذاتوں کے افراد کو خود اعتمادی کی بنیاد پر اوپر اٹھنے کے لیے ہمیشہ متوجہ کیا۔ ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ حقوق اور وسائل سے محروم افراد کو ترقی کے مواقع ملیں اور ملک صحیح معنی میں خوش حال بنے۔ ملک کی آزادی کے بعد سماج میں رونما ہونے والی خرابیوں کو دیکھ کر وہ بہت فکرمند تھے ایک موقعے پر انھوں نے واضح طور پر کہا: مجھے پڑھے لکھے لوگوں نے بڑا دھوکہ دیا ہے۔ ان لوگوں سے امید تھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے سماج کی خدمت کریں گے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ غلام، کلرکوں، افسروں اور سیاست دانوں کی ایک بھیڑ اکٹھی ہوگئی ہے۔ جو سماجی خدمت کے بجائے اپنا پیٹ پالنے میں لگی ہوئی ہے۔''

ڈاکٹر امبیڈکر کے شعور میں انسانیت اور انسان دوستی کی جو روشنی جلوہ گر تھی وہ ہر ظلمت پسندی سے ٹکرا کر برابر فتح حاصل کرتی رہی۔ وہ ہندوستان کے ماضی سے نکل کر مستقبل کا ایک حصہ بن گئے۔ ایسے مستقبل کا حصہ جس کی تعمیر کی ابتدا خود انھوں نے کی تھی۔ ان کی تعلیمات آج بھی فرد کو امید و اعتماد کے سہارے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہیں اور یہ یقین دلاتی ہیں کہ فرد ہی سب سے اونچا ہے اور جو کچھ ہے وہ بھی فرد کے لیے اور اس کے مفاد میں ہے کیوں کہ فرد ہی انسانی زندگی کی اکائی ہے۔

عہد حاضر کے تناظر میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بھی ڈاکٹر امبیڈکر کے بنائے ہوئے راستے پر گامزن ہوں اور ملک کو خوشحال، متحد اور طاقتور بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں ان کے تئیں یہی ہمارا سچا اور صحیح خراج عقیدت ہوگا۔

□□□

پتہ
C/o Abdul Wahab, Q. No. 5,
C.P.W.D. Inquiry Office,
Sect. 5, R.K. Puram, New Delhi-110022

ہمارا نیا ای میل آئی ڈی

Email:urduduniyancpul@yahoo.co.in

قومی اردو کونسل، ماہ نامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' سے خط و کتابت
بذریعہ ای میل اب اس پتے پر کریں۔

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

ہندوستان کی ثقافت وتہذیب تاریخی پس منظر

مصنف: ڈی. ڈی. کوسمبی

مترجم: بالمکند عرش ملسیانی

ہندوستان کی تہذیب وثقافت دنیا کی چند قدیم تہذیبوں اور ثقافتوں میں سے ایک ہے۔ مشہور مورخ ڈی. ڈی. کوسمبی نے اس کتاب میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کے سرچشموں کی نشاندہی کے علاوہ اس کی بالیدگی وترقی کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ ماقبل تاریخ عہد کی ثقافت، آریوں کی آمد اور مگدھ سلطنت کو خصوصیت سے موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

صفحات: 319، قیمت: 73/- روپے

شیر شاہ اور اس کا عہد

مصنف: کالکا رنجن قانون گو

مترجم: رام آشرے شرما

شیر شاہ دنیا کی ان بڑی ہستیوں میں سے ایک ہے جن کے ساتھ تاریخ نے انصاف نہیں کیا ہے۔ اس کی سب سے اہم وجہ غالباً یہ رہی کہ شیر شاہ کی وفات کے دس سال کے اندر اس کا خاندان نیست ونابود ہو گیا اور زمام اقتدار پھر مغلوں کے ہاتھ میں آ گئی جنھیں شیر شاہ سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس کتاب میں فارسی زبان کے جملہ دستیاب ماخذ اور دیگر ذرائع کی مدد سے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 704، قیمت: 135/- روپے

تاریخ جہانگیر

مصنف: ڈاکٹر بینی پرشاد

مترجم: رحم علی الہاشمی

مغلیہ سلطنت کے چوتھے فرماں روا جہانگیر کے بارے میں لکھی گئی زیادہ تر کتابوں میں مغربی مورخین کی آرا سے استفادہ کیا گیا ہے جن کی صحت پر شک کی کافی گنجائشیں ہیں۔ اس کتاب میں پہلی مرتبہ تزک جہانگیری، اقبال نامہ اور دیگر فارسی تاریخوں، معاصر یورپیوں کے سفرناموں اور خطوط کی مدد سے جہانگیر کے عہد حکومت کے تمام اہم سیاسی اور فوجی کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

صفحات: 365، قیمت: 90/- روپے

تاریخ شاہجہاں

مصنف: ڈاکٹر بناری پرشاد سکسینہ

مترجم: ڈاکٹر سید اعجاز حسین

شاہجہاں کا عہد حکومت ہندوستانی تاریخ کا ایک زریں باب سمجھا جاتا ہے۔ اس عہد میں ہر طرف امن چین اور خوش حالی تھی اور ہر طرف علم وہنر کی ترقی نظر آتی تھی۔ اسی عہد میں تاج محل، لال قلعہ اور جامع مسجد جیسے ہند مغل فن تعمیر کے بہترین نمونے بھی وجود میں آئے اور بڑے بڑے جنگی معرکے بھی سر ہوئے لیکن اسی عہد میں عظیم مغلیہ سلطنت کے زوال کے آثار بھی نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر بناری پرشاد سکسینہ نے ان تمام حقائق کا معروضی جائزہ پیش کیا ہے۔

صفحات: 446، قیمت: 109/- روپے

جنوبی ہند کی تاریخ

مصنف: کے. ایل. نیل کنٹھ شاستری

مترجم: آر. کے. بھٹناگر

اس کتاب میں جنوبی ہندوستان کی قدیم تاریخ سے سترھویں صدی کے نصف تک کی مدت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جس میں جنوبی ہند کے جغرافیائی حالات، آریوں کا عروج، موریہ سلطنت، ستواہن، بہمنی اور وجے نگر سلطنتیں اور ان کا ادب، آرٹ، مذہب اور فلسفہ وغیرہ زیر بحث آئے ہیں۔

صفحات:، 567، قیمت: 114/- روپے

علی وردی اور اس کا عہد

مصنف: کالی کنکر دتا

مترجم: عبدالاحد خاں خلیل

جب مغلیہ سلطنت کی بنیادیں کمزور ہوئیں تو ملک کے مختلف خطوں میں خود مختار حکومتیں وجود میں آنے لگیں۔ بنگال میں علی وردی خاں نے 1740 میں اپنی حکومت قائم کی۔ اس کتاب میں علی وردی کے حالات زندگی، بنگال، بہار اور اڑیسہ پر اس کا قبضہ، مرہٹوں کے حملے، افغانوں کی بغاوت اور دیگر اہم واقعات کے ساتھ ساتھ اس عہد کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی صورت حال پر بنیادی ماخذ کی مدد سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 392، قیمت: 86/- روپے

انقلاب 1857

مرتب: پی. سی. جوشی

انقلاب 1857 ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے جس کے ملک اور قوم پر دوررس اثرات مرتسم ہوئے۔ یہ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے پہلی قومی بغاوت تھی جس نے ملکی سطح پر یکجہتی کے جذبات کو ابھارا۔ اس کتاب میں مختلف شعبۂ حیات پر اس کے اثرات پر ہندوستانی مورخین اور ادیبوں کے علاوہ غیر ملکی قلم کاروں کے بھی چند مقالات شامل کیے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس انقلاب کا بین الاقوامی سطح پر بھی غیر معمولی نوٹس لیا گیا۔

صفحات: 359، قیمت: 75/- روپے

انقلاب فرانس

مصنف: جے. ایم. تھامسن

مترجم: بی. جے. سنگھ

1789 کا انقلاب فرانس تاریخ عالم کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے جس نے تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ آنے والے دنوں میں اس نے دنیا کی دیگر اقوام کو ظلم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے اور ظالم حکومتوں کا تختہ پلٹ دینے کا عزم وحوصلہ عطا کیا۔ اس کتاب میں اس عظیم انقلاب اور اس کے اثرات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 758، قیمت: 140/- روپے

RNI No. 70323/99
DL-SW-15/4104/2006-08
Date of Publication : 24/04/08
Date of Dispatch : 25&26/04/08

URDU DUNIYA Monthly, May 2008, Vol. 10, Issue: 5
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

''فکر و تحقیق''

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نا معلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے

اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

سالانہ قیمت بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

دہلی سے باہر کے خریدار صرف ڈرافٹ یا منی آرڈر ہی ارسال کریں۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	سادہ ڈاک آرڈینری	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	316 روپے
نیپال	160 روپے	228 روپے	292 روپے	360 روپے
بنگلہ دیش	146 روپے	174 روپے	238 روپے	306 روپے
دیگر ممالک	160 روپے	220 روپے	336 روپے	396 روپے

Printed and Published by Dr. Ali Javed, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Dr. Ali Javed, Tel : 26103381, 26103938